عتیق صدیقی

سری نگر

دلی

PDF CREATED BY
SHAMIM KHAN

شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم

فہرست عنوانات

شیخ عبداللہ
کشمیر
اور
ہم

عتیق صدیقی

مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی

شیخ عبداللہ کشمیر اور ہم



ایک کشمیری شال باف

۱۴ نومبر ۱۹۶۷

قیمت -/9

یونین پرنٹنگ پریس دہلی

رہائی اور دوبارہ گرفتاری

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

جواہر لال نہرو کے بعد

حرفِ آخر

ضمیمہ

جواہرلال نہرو کی یاد میں

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا تیرے بعد!



پیش لفظ

گزشتہ سال، ستمبر ۱۹۶۶ء میں، سری نگر کے کافی ہاؤس میں ایک کشمیری دوست سے باتیں کرتے ہوئے اس خیال نے جنم لیا کہ "نیا کشمیر" کے نام سے کشمیر کے گزشتہ بیس برسوں (۱۹۴۷ء - ۱۹۶۶ء) کی تاریخ مرتب کی جائے، اور اس میں ریاست کے سیاسی، اقتصادی و سماجی حالات کا بے لاگی سے جائزہ لیا جائے۔ کتاب کا خاکہ تیار کرنے کے بعد بعض کشمیری کرم فرماؤں سے بھی میں نے اس کا ذکر کیا، جن سے اس کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ انھوں نے بھی اس خیال کو پسند کیا، اور ہر ممکن امداد دینے کا بھی یقین دلایا۔

چند روز کی محنت کے بعد کتاب کا خاکہ میں نے تیار کر لیا، جو تین ابواب پر مشتمل تھا۔ دوسرے باب کا پہلا عنوان تھا "شیخ عبداللہ کی گاڑی پٹری سے اتر گئی"۔ مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس عنوان کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں وہ تمام الزامات تھے، جو گزشتہ پندرہ برسوں میں شیخ عبداللہ پر سرکاری وغیر سرکاری طور پر لگائے گئے ہیں۔

دسمبر ۱۹۶۶ء میں اسی کتاب کا مواد جمع کرنے کے لئے میں سری نگر گیا۔ اس کام میں جن دوستوں سے عملی تعاون کی امید تھی، وہ انتخابات کے بخار میں بے طرح مبتلا تھے، بلکہ ان کا یہ متعدی مرض کچھ حد تک مجھے بھی لگ گیا۔ میں کم و بیش دو مہینے وہاں رہا، اور اس دوران

میں اکثر ایسے کشمیریوں سے بھی میری ملاقات ہوئی جن کے سوچنے کا ڈھنگ میرے ذہن سے بالکل مختلف تھا۔ ان سے اکثر طویل بحثیں بھی ہوئیں۔ نہ تو میں انھیں اپنا ہم نوا بنا سکا، اور نہ وہ مجھے قایل کر سکے، لیکن ان بحثوں نے میرے دل میں یہ کھٹک ضرور پیدا کر دی کہ شیخ عبداللہ کے بارے میں شاید ہماری معلومات ناقص ہیں۔

جون ۱۹۶۷ء میں اُسی کتاب کے سلسلے میں دوبارہ سری نگر گیا تو شیخ عبداللہ سوالیہ نشان بن کر پھر میرے سامنے آ گئے۔ بعض کشمیری دوستوں نے کچھ دستاویزی مواد فراہم کر کے اس سوالیہ نشان کو اور بھی اجاگر کر دیا۔ اب میں نے سوچا کہ پہلے شیخ عبداللہ ہی کے بارے میں مواد جمع کیا جائے۔ یہ کام جوں جوں آگے بڑھا، شیخ عبداللہ کے باب میں اپنی سمجھ کے بارے میں میرے شبہات قوی تر ہوتے گئے۔

آگے آنے والے صفحات میرے اسی ذہنی سفر کا نتیجہ ہیں۔ میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا، لیکن اس نے بڑھتے بڑھتے طویل مقالے کی شکل کر لی، جسے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میرے اکثر دوستوں کو، جن میں کشمیری دوست خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، میری یہ "جرأت رندانہ" شاید پسند نہ آئے۔ میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔ ہندستان کے کشمیری نژاد شاعر ـــــ اقبال کے الفاظ میں:

اپنے بھی خفا مجھ سے، بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بڈشاہ ہوٹل۔ سری نگر
۱۵ اگست ۱۹۶۷

عتیق صدیقی

"شیخ عبداللہ پر آپ نکتہ چینی کر سکتے ہیں۔ وہ کوئی خدا نہیں ہیں، ان سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اور ان سے اور بہت سی غلطیاں ہوں گی۔ وہ بہادر انسان اور اپنی قوم کے عظیم رہنما ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اچھے اور برے دنوں میں انھوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کی ہے عظیم مصایب کے دور میں بھی اپنی قوم کو انھوں نے راہ دکھائی ہے' اور آڑے وقت میں بھی اپنی قوم کی قیادت کرنے سے انھوں نے منہ نہیں موڑا ـــــ یہ بڑی بات ہے، جو کسی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ان میں اگر کوتاہیاں ہیں، ان سے اگر ایک دو غلطیاں ہوئی ہیں، یا ان کی کوئی تقریر ہمیں پسند نہ آئی ہو، تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ بڑائی سیکڑوں غلطیوں کے بعد بھی، بڑائی ہی رہتی ہے"

جواہر لال نہرو

تقریر لوک سبھا: ۷ اگست ۱۹۵۲ء

آغاز داستان

جنوری ۱۹۶۶ء کی ایک شام کو سری نگر ہی میں، اپنی زیر کتابت تالیف ـــــ "یادوں کے سائے" کی کاپیوں کا اصل مسودے سے مقابلہ کر رہا تھا[لہ] کہ ایک کشمیری دوست، خلاف توقع اپنے وعدے کے مطابق آ گئے۔ کتاب کا جواب اُس وقت میرے سامنے تھا، ان کے تقاضے پر، میں نے سنانا شروع کیا، جسے بڑی دلچسپی سے وہ سنتے رہے۔

"وہ ٹکڑا پھر پڑھئے" پورا باب سننے کے بعد انھوں نے کہا "جو اگست کے سلسلے میں آپ نے لکھا ہے۔ ہماری آج کی بات چیت یہیں سے شروع ہوگی۔"

"ہندستان میں اگست کا مہینہ" میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا "جس کا ذکر کرتے ہوئے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ـــــ اُمس اور گرمی کا یا پھر موسلا دھار بارش کا مہینہ ہونے کے باوجود ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے دیس کی کھیتی باڑی پر اس کا جو اثر پڑتا ہے، اسے جانے بھی دیا جائے، تو نئے ہندستان کی تاریخ کو بنانے اور بگاڑنے میں بھی اس مہینے کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے اگست ہی کے مہینے

لہ یہ کتاب مکتبہ شاہراہ سے عن قریب شایع ہونے والی ہے

میں ہمارے دیس نے ’ ہندستان چھوڑ دو ‘ کا نعرہ لگایا تھا۔ اس کے چار سال بعد ۱۹۴۶ء کے اگست ہی میں ہندستان آزادی و خانہ جنگی کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راہیں تھیں۔ اسی اگست کے مہینے میں خود مختار عارضی حکومت بننے کی بات چیت امید کے ایک پتلے سے دھاگے کے سہارے چلتے چلتے ایک بڑے ہی نازک موڑ پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف عارضی حکومت کے بننے میں بادھا ڈالنے کے لئے مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کی دھمکی کا بھیانک عملی روپ کلکتے میں ہمارے سامنے آچکا تھا۔ دیس سے جو خبریں آرہی تھیں، خاص کر کلکتے سے، انھیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ بس ایسا لگتا تھا کہ شیخ چلی کی طرح آزادی کا ایک خیالی محل ہم نے بنایا تھا، پھر ہم ہی نے ایک ایسی لات گھمائی کہ خیالات کا سارا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ اور بس:

” خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا!

” ایسے وقت میں ... “

” بس رہنے دیجئے “ مجھے روکتے ہوئے کشمیری دوست نے کہا ” اگست کا مہینہ یقیناً ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے جس زمانے (۱۹۴۲ء) کا ذکر کیا ہے، اس کے گیارہ سال بعد، اگست ہی کے مہینے میں اور ٹھیک اسی تاریخ ــــ جس تاریخ ہمارے دیس نے ’ ہندستان چھوڑ دو ‘ کا نعرہ لگایا تھا ــــ ایک اور واقعہ پیش آیا، جس نے بڑی حد تک ہندستان کی تاریخ کے ایک دھارے کا رخ ہی بدل دیا۔ “

” کس واقعے کی طرف آپ اشارہ کر رہے ہیں؟ “ میں نے سوال کیا۔

” یہ واقعہ نہیں، بلکہ ایک عظیم حادثہ تھا “ انھوں نے رک رک کر کہا، جیسے اظہار خیال کے لئے انھیں مناسب الفاظ نہ مل رہے ہوں ” ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو کشمیر کے سیاسی اسٹیج پر ایک بھیانک اور گھناونا ناٹک رچایا گیا، جس نے کشمیر اور ہندستان کے اس رشتے کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، جسے کشمیریوں نے بڑی توقعات کے ساتھ، ۴۷ء میں ہندستان کے ساتھ جوڑا تھا۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک عظیم المیہ ہے جو ایک عظیم تر سازش کا نتیجہ تھا۔ اب آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے، اور کشمیری ہوتے اگر آپ تو پہلے ہی سمجھ جاتے، کہ میرا اشارہ شیخ عبداللہ کی وزارت عظمیٰ سے برطرفی اور گرفتاری کی طرف ہے۔ یہ حادثہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو پو پھوٹنے سے پہلے ڈھائی تین بجے صبح کو گلمرگ میں پیش آیا تھا۔ “

اس شام کو دیر تک ہم دونوں اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں بدل گیا۔ کشمیری دوست کے رخصت ہونے کے بعد جب اپنی یادداشتوں کو میں نے پڑھا، جو گفتگو کے دوران میں نے قلم بند کر لی تھیں، تو پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ کشمیر اور شیخ عبداللہ کے بارے میں میری، اور میرے ہی جیسے ان گنت ہندستانیوں کی سمجھ میں شاید کوئی بنیادی خرابی ہے۔ جوں جوں میں نے اس پر غور کیا، میرا گمان یقین میں بدلتا گیا، جس نے میری اس کتاب کے خاکے میں بھی بنیادی تبدیلی پیدا کی، جو ” نیا کشمیر ــــ تین رخ “ کے نام سے میں لکھنا چاہتا تھا، اور جس کا مواد جمع کرنے ہی کے لئے میں سری نگر آیا تھا۔

” پچھلے تیرہ چودہ برسوں میں “ اسی کشمیری دوست نے مجھے بتایا ” ہندستانی

حکومت اور ہندستانی عوام نے شیخ عبداللہ کے ساتھ جو ناانصافی کی ہے، اور بخشی غلام محمد نے دس سال تک کشمیری عوام کے ساتھ جس قسم کا سلوک روا رکھا ہے، اس نے ہندستان کے ساتھ محبت و یک جہتی کے ان سوتوں ہی کا منہ بند نہیں کیا ہے جو ۱۹۴۷ کے پاکستانی حملے کے بعد کشمیر کے کوہساروں اور مرغ زاروں سے ابل پڑے تھے، بلکہ پوری وادی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بارودی سرنگیں بھی بچھا دی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کشمیر اور ہندستان کے تعلقات کا وہ محل، جسے کشمیریوں نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں سے تعمیر کیا تھا کہیں شیخ چلی ہی کا خواب نہ بن جائے، اور آپ ہی کی طرح ہمیں بھی کہنا پڑے کہ:

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

"میری یہ باتیں آپ کو شاید عجیب سی معلوم ہو رہی ہوں گی" رخصت ہوتے ہوئے کشمیری دوست نے کہا "مجھے یقین ہے کہ اتنی بار کشمیر آنے کے بعد بھی کشمیری ذہن کو آپ نہ سمجھ سکے ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم کشمیری بہت کم کسی کے سامنے اپنا ذہن کھول کر رکھنے کے عادی ہیں، جو شاید ہمارے مخصوص تاریخی حالات کا نتیجہ ہے، اور پھر دس سال کی 'بخشی گردی' (۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۳ء) نے تو ہماری یہ عادت اور بھی پختہ کر دی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں آپ کے جو کشمیری دوست ہیں، وہ سب احمقوں کی جنت میں رہنا پسند کرتے ہیں اور باہر سے آنے والوں کو بھی اسی جنت کی سیر کراتے ہیں۔ میری ان باتوں سے آپ بدگمان نہ ہوں۔ میں تو کشمیری پنڈت ہوں

میرے پاکستانی ہونے کا سوال ہی نہیں، کیوں کہ پاکستان میں میرا کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا۔ میرا مفاد تو ہندستان ہی کے ساتھ وابستہ ہے، اور میری دلی تمنا تو یہی ہو سکتی ہے کہ کشمیر ہندستان ہی کا اٹوٹ انگ رہے لیکن میرا ایمان ہے کہ اس مشکل کام کو شیخ عبداللہ ہی انجام دے سکتے ہیں، جنھیں آپ ہندستان کا دشمن سمجھ بیٹھے ہیں"۔

کشمیری دوست کے بعض خیالات سے اختلاف ہونے کے باوجود میں نے خاموشی سے اُن کی باتیں سنیں۔ یہی باتیں کسی کشمیری مسلمان نے کی ہوتیں تو انھیں پاکستانی ذہن کی پیداوار سمجھ کر میں شاید قابلِ اعتنا نہ سمجھتا لیکن یہ باتیں تو ایک کشمیری پنڈت کی زبان سے میں نے سنی تھیں، جس کا پاکستان میں "کوئی مستقبل نہیں ہو سکتا" تھا اور جس کا "مفاد تو ہندستان ہی کے ساتھ وابستہ" تھا۔

"ہمارے کشمیری بھائی اگر یہ چاہیں کہ ہندستان کشمیر سے دست بردار ہو جائے" اسی کشمیری دوست سے میں نے ایک دوسری ملاقات میں کہا "تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اپنے کشمیری دوستوں سے اکثر میں کہتا ہوں کہ الحاق کی دستاویز تو خطِ تقدیر ہے، جسے کوئی مٹا نہیں سکتا، مگر ہم اور آپ مل کر اسے خوش گوار ضرور بنا سکتے ہیں۔ آج ریاست جموں و کشمیر ہمارے ملک کی اہم ترین سرحدی ریاست ہے۔ پہلے پاکستانی حملے کے بعد تو ایک مدت تک کشمیر کے الحاق کا مسئلہ ہمارے قومی وقار ہی کا مسئلہ بنا رہا، لیکن نیفا و لداخ پر چینی حملے کے بعد شمال میں کشمیر ہماری دفاعی شہ رگ بن گیا ہے، جسے کسی قیمت پر ہم کٹنے نہیں دے سکتے۔ پچھلے بیس برسوں میں پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی جو نوعیت رہی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ پھر چین و پاکستان

کی نئی دوستی نے، خواہ وہ کیسی ہی غیر فطری اور کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہو، کشمیر کی اہمیت ہمارے لئے اور بھی بڑھادی ہے۔"

"یہ تو تصویر کا ایک ہی رخ ہے" کشمیری دوست نے جواب دیا "ہندستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق میں جو دلیل آپ نے پیش کی ہے، یا اور جو بہت سی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، وہ تصویر کا ایک ہی رخ اور ہندستانی مصالح کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ ہر تصویر کی طرح مسئلہ کشمیر کی تصویر کا بھی ایک دوسرا رخ ہے، اور جب تک اسے بھی آپ نہ دیکھیں، پوری تصویر سامنے نہ آئے گی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ خود کشمیریوں کے احساسات وجذبات ہیں، جن کی نمائندگی شیخ محمد عبداللہ کرتے ہیں۔ کشمیر کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اور کشمیر کو حقیقی معنوں میں ہندستان کا اٹوٹ انگ بنانے کے لئے کشمیریوں کے احساسات وجذبات کو سمجھنا ہی نہیں بلکہ انھیں آسودہ کرنا ہوگا۔ کشمیریوں کے دلوں میں جو گتھیاں پڑ گئی ہیں، انھیں کھولنا ہوگا۔

"اس کام کی توقع صادق صاحب سے بھی تھی۔ برسر اقتدار آتے ہی شہری حقوق کو بحال کرکے، اس سمت میں انھوں نے قدم بھی بڑھایا تھا، لیکن انھیں سازگار ماحول نہ ملا، اور ایک دو کے علاوہ انھیں اچھے ساتھی بھی نہ مل سکے۔ پھر سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ کشمیر پر ہندستانی دستور کی دفعات کے نفاذ کی جو ریل پیل رہی، اس نے صادق صاحب کے عزائم کی تکمیل کو ناممکن بنا دیا۔ صادق صاحب کے ساتھ میں نے کام کیا ہے، شیخ عبداللہ کے بعد کشمیر میں ان ہی کی میں سب سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ شرافت ومروت میں ان کا جواب نہیں ہے، لیکن

ان کی یہ خوبیاں بھی کبھی کبھی ان کے لئے زنجیر پا بن جاتی ہیں۔

"میری دلی تمنا ہے" کشمیری پنڈت دوست نے کہا "کہ شیخ عبداللہ اور صادق صاحب کی کسی طرح پٹری بیٹھ جائے۔ اگر یہ ہو جائے تو وہ بالکل ہو سکتا ہے، جو شیخ عبداللہ اور صادق دونوں چاہتے ہیں۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ ہندستان وکشمیر کے رشتے کا جہاں تک تعلق ہے صادق اور عبداللہ میں صرف چند قدموں کا فاصلہ ہے۔ ایک، دو قدم آگے جانا چاہتا ہے اور دوسرا دو قدم پیچھے رہنا چاہتا ہے۔"

"کشمیریوں کا ذہنی مرض بہ ظاہر لا علاج ہے" ادھیڑ عمر کے ایک کشمیری مسلمان نے کہا جنھیں میرے کشمیری پنڈت دوست اپنے ساتھ لائے تھے "آپ کے خیال سے میں متفق ہوں کہ پاکستان کے سیاسی، اقتصادی وسماجی ڈھانچے میں کشمیر کھپ نہ سکے گا، اور مجھے اس سے بھی اتفاق ہے کہ اِس کشمیر کو، اُن زرعی وسماجی اصلاحات کے ساتھ جو یہاں رائج ہو چکی ہیں، اپنے ساتھ ملا کر پاکستان داخلی انقلاب کو دعوت دینے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کشمیری ذہن ہندستان میں ضم ہونے کی طرف بھی مایل نہیں ہے، جس پر ہندستانی رائے عامہ مصر ہے۔ رہا آزاد کشمیر کا سوال۔ کشمیری نوجوانوں کے دلوں کو یہ بہت بھاتا ہے، لیکن یہ اگر ممکن الحصول بھی ہو، تو خطرے سے خالی نہیں، اور اس کے لئے ہندستان وپاکستان دونوں تیار نہ ہوں گے۔ ہمارے مرض کے یہ پہلو روز بروز واضح سے واضح تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ وہ مایوسی وناامیدی ہے، جو افراد ہی کو نہیں بلکہ قوموں

کو بھی خودکشی کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس دن سے ہندستان اور پاکستان دونوں کو ڈرنا چاہیئے جب کشمیری قوم جان پر کھیلنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

"ایک بات میں آپ سے کہوں گا، جسے شاید آپ باور نہ کرسکیں گے" مسلمان کشمیری دوست نے کہا "کشمیر کا مسئلہ اگر کوئی حاصل کرسکتا ہے، یا یوں کہیئے کہ اس مسئلے کو حل کرنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہے، تو وہ ایک ہی شخص ہے، اور اس کا نام شیخ محمد عبداللہ ہے، جس کے ساتھ آپ نے، ارادی یا غیر ارادی طور پر، بڑی زیادتیاں کی ہیں، اور ابھی تک کر رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی زندگی میں شیخ عبداللہ نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار کہا تھا کہ کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی کنجی جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں ہے۔ جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد یہ کنجی شیخ عبداللہ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اب وہی اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں، اور ایسا کرنا، کشمیری ہونے کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ جواہر لال نہرو کے دوست کی حیثیت سے بھی ان کا مقدس فرض ہے۔ لیکن اس فرض کی ادائیگی کے لئے آپ کو شیخ عبداللہ کو رہا کرنا ہوگا، ان پر بھروسہ کرنا ہوگا، ان کا ہاتھ بٹانا ہوگا، اور ایسی سازگار فضا پیدا کرنی ہوگی جس میں وہ اپنا فرض آسانی سے ادا کرسکیں شیخ عبداللہ کی زندگی میں یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو آگے چل کر یہ بڑی ہی خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے۔"

اسی طرح کے خیالات ایک غیر کشمیری دوست نے بھی مجھ سے ظاہر کیئے، جو ایک مدت سے کشمیر میں رہ رہے ہیں:

"کشمیر اور ہندستان کے تعلقات کی نوعیت کا مسئلہ شیخ عبداللہ کی زندگی ہی میں قطعی طور پر دو اور دو چار کی طرح ہمیں طے کرلینا چاہیئے مجھے یقین ہے کہ فروعات میں اختلاف کے باوجود ہمارے اور شیخ عبداللہ کے بنیادی تصورات میں آج بھی بڑی یکسانیت ہے۔ جمہوریت اور سکولرازم، ہماری ہی طرح شیخ عبداللہ کے ایمان کا بھی جزو ہیں۔ سوشلزم کے بھی وہ قایل ہیں، اگرچہ اس کے علمی پہلو سے شاید انھیں زیادہ واقفیت نہیں ہے۔"

اسی غیر کشمیری دوست کے تجزیئے کے مطابق:

"آج کشمیری، بہ اعتبارِ عمر، تین حصوں میں بانٹے جا سکتے ہیں:

"۱۔ وہ لوگ جن کی عمر چالیس سال سے اوپر ہے۔ یہ وہ ہیں جو ۱۹۴۷ء میں نوجوان یا جوان تھے۔ ان کا سیاسی شعور نیشنل کانفرنس کی جدوجہد کے سائے میں پختہ ہوا تھا۔ ان میں سے بیشتر نے کشمیر کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا تھا، جو ہندستان ہی کی وسیع تر تحریک آزادی کا حصہ تھی۔ ہندستانی تصورات کے ساتھ اس نسل کو آج بھی ذہنی ربط ہے۔ یہ لوگ گاندھی جی اور جواہر لال کا نام آج بھی محبت اور احترام سے لیتے ہیں۔ ہندستان سے برگشتہ ہونے کے باوجود ان کے سوچنے کا ڈھنگ آج بھی ہندستانی ہی ہے یہ شیخ عبداللہ کی نسل ہے۔ ان کی اکثریت شیخ عبداللہ کی قیادت پر اعتماد بھی رکھتی ہے اور ہندستان سے یک سر اپنا ناتا نہیں توڑنا چاہتی، اگرچہ وہ اس کا اظہار



کشمیر میں سامان برداری کا ایک منظر

نہیں کرتی ؎[1]

"۲۔ وہ لوگ جن کی عمر تیس اور چالیس سال کے درمیان ہے۔ اس نسل کو کشمیر کی تحریک آزادی کا، اور اس میں ہمارے حصے کا ایک مبہم سا تصور ہے۔ ان میں سے بیش تر ۱۹۴۷ء میں سن شعور کو تو پہنچ چکے تھے، مگر ان کا شعور اس وقت تک بالغ نہیں ہوا تھا۔ یہ ہم سے یقیناً برگشتہ ہیں۔ لیکن شیخ عبداللہ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر انھیں ہمارے قریب لا سکتے ہیں۔

"۳۔ نوجوان جن کی عمر بیس اور تیس سال کے درمیان ہے۔ ان میں سے بیش تر نے ۱۹۴۷ء کے بعد ہوش سنبھالا ہے، اور ان کا شعور ایک خطرناک نظریاتی دور میں پختہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے حالات و روایات سے وہ یک سر ناآشنا ہیں۔ ہندستان کے ساتھ انھیں کسی قسم کا ذہنی ربط نہیں ہے۔ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کا ماضی ان کے لئے ایک سر بہ مہر کتاب ہے۔ کشمیر کی اس نئی نسل نے گاندھی جی کی اہنسا کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ اس نے تو آنکھیں

؎[1] اس خیال میں یقیناً صداقت ہے۔ جولائی ۱۹۶۷ء کے آخری ہفتے میں یہ افواہ سری نگر میں "مصدقہ" طور پر بیان کی جاتی تھی کہ شیخ عبداللہ اور حکومت ہند میں ایک ایسا سمجھوتہ ہو گیا ہے جس کے مطابق کشمیر ہندستان ہی کا حصہ رہے گا، لیکن کشمیریوں کے مطالبات کی بھی اس سے تکمیل ہو سکے گی۔ سری نگر کے عبدلائی حلقے میں اس افواہ نے بڑی طمانیت پیدا کی تھی اور اس گروہ کے لوگ عام طور پر اس سے خوش اور مطمئن تھے۔

کھول کر ہندستان کی فوجوں اور ہندستان کی پولیس ہی کو دیکھا ہے۔ کشمیر کی نئی نسل، جس سے کل ہمیں سابقہ پڑے گا، اس کی سانس سے بارود کی بو آتی ہے، یہ ایک ایسا آتش گیر مادہ ہے جو کسی وقت بھی، صرف کشمیر ہی کو نہیں بلکہ، پورے برصغیر ــــ ہندستان و پاکستان کو آتش کدہ بنا سکتا ہے۔

"کشمیری نوجوانوں کی اس ذہنی ساخت کے پیش نظر کشمیر کا مسئلہ، شیخ عبداللہ کی وساطت سے، جلد سے جلد طے کر لینا چاہئے، جو ہماری جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ہندستان میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ساتھ شیخ عبداللہ نے کاندھے سے کاندھا ملا کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی، اور جو آج بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیخ عبداللہ سے باتیں کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اس فہرست میں سب سے زیادہ اہم نام تو خود ہماری وزیر اعظم اندرا گاندھی کا ہے، جن کے گھرانے میں شیخ عبداللہ کی حیثیت کنبے ہی کے ایک فرد کی سی تھی اور شاید آج بھی ہے۔"

پس منظر

"(کشمیر کی) موجودہ صورت حال ہی نہیں، بلکہ اس کا پس منظر بھی مجھے بیان کرنا ہے۔ ماضی قریب میں جو کچھ ہوا ہے، ممکن ہے کہ اسے ہم بھول گئے ہوں۔ حال کو سمجھنے کے لئے ماضی کو سامنے رکھنا ضروری ہے"

جواہر لال نہرو

(تقریر لوک سبھا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۵۲ء)

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا سترہ سالہ دور ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کا اہم ترین زمانہ ہے۔ ملک کے طول وعرض میں اس وقت دو طاقتیں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھیں۔ ایک طرف انڈین نیشنل کانگرس اور چھوٹی چھوٹی ترقی پسند جماعتیں تھیں اور دوسری طرف برطانوی سامراج تھا، جس کی پشت پر ہندو مہاسبھا، مسلم لیگ اور رجواڑے تھے۔

کشمیر میں دو قومی نظریے کی شکست

اس دور میں کشمیر ہی ایک ایسی دیسی ریاست تھی جس کے عوام نے، نیشنل کانفرنس کی قیادت میں، کھل کر اور ڈٹ کر اپنا رشتہ انڈین نیشنل کانگرس سے جوڑا۔ ہماری نئی پود تو اس تاریخی حقیقت سے ناآشنا ہوگی، لیکن پرانی نسل کے لوگ ابھی نہ بھولے ہوں گے کہ پورے ملک میں کشمیر اور صوبۂ سرحد ہی دو ایسے علاقے تھے جہاں مسلم لیگ کا دو قومی نظریہ پنپ نہیں سکا تھا۔ کشمیر اس سلسلے میں خصوصیت سے یوں بھی قابل ذکر ہے کہ عین اس زمانے میں جب کہ مسلم لیگ اپنے پورے شباب پر تھی، تو مسلم کشمیری عوام نے مسٹر جناح کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا، جو ملک کے دوسرے علاقوں میں مولانا آزاد اور دوسرے مسلمان کانگرسی لیڈروں کے ساتھ مسلم لیگی روا رکھتے تھے، اور یہ اسی

تلخ تجربے کا نتیجہ تھا کہ کشمیریوں کی "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کو مسٹر جناح نے غنڈوں کی تحریک گردانا تھا۔

ہندستان و پاکستان کے باب میں کشمیری نقطہ نظر

تقسیم کے وقت، ۱۹۴۷ء میں، یہ خیال عام تھا کہ کشمیر کے الحاق کا مسئلہ اگر کشمیری عوام کی رائے پر چھوڑا گیا تو وہ ہندستان کو پاکستان پر ترجیح دیں گے آزادی کا سورج طلوع ہونے سے دو ہفتے قبل گاندھی جی دو دن کے لیے کشمیر گئے تو وہ بھی یہ خیال لے کر واپس لوٹے کہ:

"شیخ عبداللہ اور دوسرے لیڈروں کو رہا کرنے کے بعد حکومت جموں و کشمیر رائے شماری کرائے تو ریاست کی اکثریت کا ووٹ ہندستان کے حق میں جائے گا۔[1]"

ہندستان و پاکستان کی آزاد مملکتوں کے وجود میں آنے کے وقت، اگست ۱۹۴۷ء میں کشمیریوں کے سیاسی رجحانات و میلانات سے مسٹر جناح سے زیادہ اور کوئی واقف، اور ان سے خایف، نہیں تھا۔ انھیں اس کا یقین تھا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی اگر رہا ہو گئے تو ان کی قیادت میں مسلم کشمیری عوام، جو مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کے مخالف تھے، پاکستان کے ساتھ نہیں بلکہ ہندستان کے ساتھ ناتا جوڑنا پسند کریں گے۔ اسی احساس کے پیش نظر مسٹر جناح نے مہاراجا ہری سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ الحاق کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے کا حق کشمیری عوام کو نہیں بلکہ خود مہاراجا کو ہے۔

۱؎ دیکھیے پیارے لال کے The Last Phase کی دوسری جلد ص ۳۵۷

"دو قومی نظریے پر ہم کبھی ایمان نہ لا سکیں گے"

آزادی کے جلو میں جو حالات پیدا ہوئے انھوں نے، مسٹر جناح کی توقع کے خلاف، مہاراجا کو، جواہر لال نہرو کے الفاظ میں "شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرنے پر مجبور کیا۔[1]" شیخ عبداللہ کی رہائی (۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء) نے پاکستانی ارباب حکومت کے اوسان خطا کر دیے۔ رہی سہی کسر شیخ عبداللہ کی اس تقریر نے پوری کر دی جو انھوں نے رہائی کے چوتھے دن، ۳ اکتوبر کو سری نگر کے عام جلسے میں کی۔ اس موقع پر انھوں نے واضح الفاظ میں کہا:

"اس وقت ریاست جموں و کشمیر کے سامنے یہ سوال ہے کہ ہم ہندستان کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے ساتھ، یا آزاد رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر ہوں، جس کی پالیسی بالکل واضح ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو میرے بہترین دوست ہیں اور گاندھی جی کی میں بے حد عزت کرتا ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے ہماری تحریک کی بڑی حد تک مدد کی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرے ذاتی عقاید کسی بھی مملکت کے ساتھ الحاق کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہ ہوں گے..."

لیکن اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ:

"اگر ہم نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا بھی فیصلہ کیا تو اس دو قومی نظریے پر ہم کبھی ایمان نہ لا سکیں گے، جو سارے ملک میں اس درجہ زہر پھیلانے کا آج ذمہ دار ہے..."

۱؎ تقریر لوک سبھا: ۲۶ جون ۱۹۵۲ء (کارروائی لوک سبھا: جلد ۲ حصہ ۲: کالم ۲۵۸۶)



۱۹۴۷ء کے پاکستانی حملے کے دوران غلام محمد صادق صاحب ایک عوامی جلسے سے خطاب کر رہے ہیں

کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے سے پاکستان کا انکار

ریاستوں کے الحاق کے طریق کار پر بھی کانگرس اور مسلم لیگ میں اختلاف تھا۔ کانگرس ریاستی عوام کو اقتدار اعلا تسلیم کئے جانے پر مصر تھی، اور مسلم لیگ ریاستی حکم رانوں کو اقتدار اعلا مانے جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ کانگرس نے اس اصول کو ان ریاستوں پر خصوصیت سے منطبق کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جن کی آبادی ایک مذہب کی اور حکم ران دوسرے مذہب کا ہو۔ کشمیر اسی ضمن کی ریاستوں میں تھا۔

نیشنل کانفرنس نے تقسیم کے بعد جی، ام، صادق، جو اب ریاست کے وزیر اعلا ہیں، اپنا نمائندہ بنا کر اس غرض سے پاکستان بھیجا کہ پاکستانی ارباب حل وعقد کو وہ اس بات پر رضا مند کریں کہ کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کر کے الحاق کے بارے میں ان کی آزادانہ رائے کا پاکستان احترام کرے اس سلسلے میں صادق صاحب نے "پاکستان کے وزیر اعظم اور دوسرے وزراء سے ملاقاتیں کیں، جو بے سود ثابت ہوئیں[1]۔"

بخشی غلام محمد کے بیان کے مطابق اس گفت وشنید میں پاکستانی ارباب اختیار نے مطالبہ کیا کہ "شیخ عبداللہ اگر یہ وعدہ کریں کہ نیشنل کانفرنس پاکستان ہی کے حق میں اوٹ دے گی"، تو نیشنل کانفرنس کا مطالبہ پاکستان

---

[1] ریاست جموں وکشمیر پر White Paper ص ۱۴

کے لئے قابل قبول ہوگا ،" لیکن نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے لئے یہ تجویز ناقابل قبول تھی[۵]۔"

قبایلیوں کے بھیس میں کشمیر پر پاکستانی حملہ

ابھی جی، ام، صادق کراچی و لاہور میں نیشنل کانفرنس کا موقف تسلیم کرانے کی کوشش میں لگے ہی تھے کہ قبایلیوں کے بھیس میں پاکستان نے ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پر حملہ کر دیا۔ شیخ عبداللہ کی رہائی کے پچیس دن اور ان کی مندرجہ بالا تقریر کے پورے انیس دن بعد پاکستان کا یہ حملہ ہوا تھا، جو یقیناً پاکستانی ارباب اقتدار کی بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کی تاریخ کا نیز ہندستان و پاکستان کی نوزائیدہ مملکتوں کے تعلقات کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

کشمیریوں نے اپنے ہم مذہب 'نجات دہندوں' کا مقابلہ کیا

دو ہزار قبایلی حملہ آور جو جدید سامان حرب سے مسلح تھے اور جن کی پشت پر رسل و رسایل کی پوری جنگی تنظیم تھی، ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو، صبح کاذب کے دھندلکے میں، کچھ پیادہ پا اور کچھ بسوں اور ٹرکوں میں مظفر آباد میں "اسلام زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے داخل ہوئے۔ اپنے کشمیری بھائیوں کو "آزادی دلانے" اور ان کی "مدد کرنے" کے لئے یہ جوق در جوق وادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

---

۵ Dawn (کراچی) مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۴۷ء ۔۔ بحوالہ سسر گپتا ص ۱۰۸

ایک امریکی اخبار نویس خاتون کو، جو اس وقت پاکستان ہی میں تھیں اس "عظیم الشان جہاد" کی خبر لگی تو پاکستانی افسروں کی نظریں بچا کر وہ کشمیر کی سرحد تک پہنچ گئیں۔

"کشمیر جا رہے ہو تم؟" خاتون نے ایک پٹھان سے سوال کیا

"ہاں کشمیر جا رہے ہیں" اس نے جواب دیا "ہم بھی آخر مسلمان ہیں، اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے"

یہی خاتون، یہ مکالمہ درج کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

"اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد کا یہ عمل اکثر جلد بہت جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا تھا، اور ان کی بسیں اور ٹرکیں مال غنیمت سے لدی پھندی ایک یا دو دن میں واپس آجاتی تھیں تاکہ اور پٹھانوں کو لے کر پھر کشمیر لوٹیں، اور اپنے مسلمان کشمیری بھائیوں کو آزاد کرانے کے اسی عمل کا اعادہ کرتے ہوئے بلا تفریق مذہب ہندو، سکھ اور مسلمان دہقانیوں کو لوٹیں[۱]"

مہاراجا کی برائے نام فوج مسلح قبایلیوں کے مقابلے میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹک سکی، اور آن کی آن میں اس کا صفایا ہوگیا، لیکن نہتے کشمیری عوام نے، جن میں مسلمانوں کی قدرتی طور پر اکثریت تھی، مظفر آباد سے لے کر مضافات سری نگر تک اپنے ہم مذہب 'نجات دہندوں' کا قدم قدم پر بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ اور یہ خونیں داستان آج بھی اُوری اور بارہ مولا کی دیوقامت پہاڑیوں ہی پر نہیں بلکہ گلمرگ اور مضافات سری نگر کے مرغزاروں کے چپے چپے پر بھی ثبت ہے۔ یہ عوامی مقابلہ صرف کشمیر ہی کی نہیں بلکہ پورے

Margret Brouke-white : *Halfway to Freedom*, pp. 207-8

برصغیر — ہندستان و پاکستان کی تاریخ کا تاب ناک ترین باب ہے۔

ان قبائلی، سیاہ دل درندوں نے ۲۲ اکتوبر کو مظفر آباد، ۲۳ کو چناری، اور ۲۴ کو اوری لوٹنے کے بعد ۲۶ کو مہورہ کے اس پاور ہاؤس کو برباد اور بے کار کر دیا، جو سری نگر کو بجلی فراہم کرتا تھا۔ پھر انھوں نے بارہ مولا کا رخ کیا جو پہاڑیوں کے دامن میں دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر آباد اور اس علاقے کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے، جہاں کے شہری ان تمام قصبوں و دیہاتوں کے بسنے والوں سے کہیں زیادہ خوش حال اور دولت مند تھے، جنھیں اب تک انھوں نے تاراج کیا تھا۔ بارہ مولا کی آبادی نے بھی، بلا تفریق مذہب، حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہیں ایک نوجوان سیاسی کارکن میر مقبول کو قبایلیوں نے بڑی بے دردی و بے رحمی سے مصلوب کیا۔ اسی شہر میں ایک مسلمان زچہ کو بچانے کی کوشش میں ایک ہندستانی عیسائی نرس کو بھی قبایلیوں کی گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ بارہ مولا کو بے طرح لوٹنے کے بعد انھوں نے سری نگر کا رخ کیا۔

راولپنڈی سے سری نگر تک موٹر سے چھ گھنٹے سے زیادہ مسافت نہیں ہے، لیکن قبایلی حملہ آوروں نے مظفر آباد سے مضافات سری نگر تک پہنچنے میں چھ دن لگا دئے، جس کی دو وجہیں تھیں — ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ کشمیری عوام نے حملہ آوروں کو بے روک ٹوک آگے بڑھنے نہیں دیا، بلکہ قدم قدم پر انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ قبایلیوں نے مقامی آبادی کو زیر کرنے کے بعد ہر قصبے اور قریئے کے ایک ایک گھر کو لوٹا۔ لوگوں کا بجا طور پر یہ خیال ہے کہ قبایلی اگر لوٹ اور غارت گری



۱۹۴۷ء کے عوامی مقابلے کا ایک منظر

اپنا وقت صرف نہ کرتے تو ہندستانی فوجوں کے سری نگر پہنچنے سے بہت قبل، وہ سری نگر پہنچ جاتے، اور سری نگر کے ہوائی اڈے پر اگر ان کا قبضہ ہو جاتا، تو ہندستانی فوج کے لئے وہاں پہنچنا یک سر ناممکن تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ !

کشمیر کے ان قبایلی 'نجات دہندوں' کے لیڈر "طارق" تھے، جن کے متعلق بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ پاکستانی فوج کے میجر جنرل اکبر خاں ہیں۔ پاکستانی فوج کے صرف ایک یہی میجر جنرل "قبایلی" بھیس میں نہیں تھے۔ بلکہ بعد میں جو قبایلی گرفتار ہوئے ان میں سے اکثر کی جیب سے پاکستانی فوجی پے بک (تنخواہ کی کتاب) نکلی۔

اس داستان کا دل چسپ ترین پہلو یہ ہے کہ میجر جنرل اکبر خاں عرف طارق نے پاکستانی ارباب حکومت کو قبایلی حملے کی کامیابی کا اس درجہ یقین دلا دیا تھا کہ پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں، "اس وقت ایبٹ آباد میں، جو کشمیر کی سرحد پہ ہے، یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ سری نگر فتح ہونے کی خبر آتے ہی شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ وہ کشمیر میں داخل ہوں[1]۔"

فوجی امداد اور الحاق کی درخواست

دہلی میں کشمیر کی امداد کی درخواست ۲۴ اکتوبر کو موصول ہوئی، جب کہ

[1] Campbell-Jhonson : *Mission With Mountbatten*, p. 225.

حملہ آور اوری پہنچ چکے تھے، اور قتل و غارت کا بازار گرم کر کے "اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد" کے فرض کی ادائیگی کا عمل شروع کر چکے تھے۔ دہلی کو صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا اندازہ نہیں تھا۔ چناں چہ امداد کی جو درخواست ۲۴ اکتوبر کو موصول ہوئی تھی، اس پر ۲۵ کو دفاعی کمیٹی میں غور کیا گیا، جس کے صدر خود گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھے۔ اسی جلسے میں پاکستان سے سرکاری طور پر آئی ہوئی یہ خبر بھی سنائی گئی کہ "قبایلی اب سری نگر سے ۳۵ میل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔" لیکن ہندستان کی حکومت فوری طور پر کشمیر کو فوجی امداد دینے کا قدم اس وقت تک نہیں اٹھا سکتی تھی، جب تک کہ، بہ قول لارڈ ماؤنٹ بیٹن، کشمیر کا ہندستان کے ساتھ باضابطہ الحاق نہ ہو جائے۔ دفاعی کمیٹی کے اس جلسے میں اس سے زیادہ اور کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا کہ ریاستوں کے محکمے کے سکریٹری وی، پی، مینن فوراً ہوائی جہاز سے سری نگر جا کر حالات کا جائزہ لیں۔

دوسری طرف سری نگر میں جو سراسیگی پھیلی ہوئی تھی اس کا اندازہ ریاست کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہاراجا کے مشورے سے ۲۵ اکتوبر کو یہ طے پایا کہ کل، ۲۶ اکتوبر کو:

> "کسی ہوائی جہاز کا انتظام ہو سکے تو دہلی جا کر فوری امداد لانے کی کوشش کی جائے، ورنہ پاکستان جا کر ہتھیار ڈال دئے جائیں... اس نازک مرحلے پر، خوش قسمتی سے، وی، پی، مینن پہنچ گئے[1]۔"

وی، پی، مینن ریاستوں کے محکمے کے سکریٹری تھے، جو دفاعی کمیٹی کی

[1] Mahajan : *Accession of Kashmir to India*, p. 16.

ہدایت کے مطابق ۲۶ اکتوبر کو سری نگر گئے تھے۔ ہوائی جہاز سے نکل کر مہاراجا کے محل تک جاتے ہوئے مینن کو سری نگر "مہیب سناٹے کی چادر میں سمٹا ہوا شہر خموشاں" نظر آیا جہاں ہر طرف کسی مبہم خوف اور بے نام ہراس کے لمبے لمبے سائے چنار کے بوڑھے تنا ور پیڑوں اور سفیدے کے سرو قد درختوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شہر میں "جگہ جگہ نیشنل کانفرنس کے والنٹیر لوگوں کو آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنے کی کوشش میں لگے تھے"۔

چند گھنٹوں کے قیام کے بعد مینن سری نگر سے لوٹے تو ان کے ساتھ ریاست کے وزیر اعظم کے علاوہ الحاق کی درخواست بھی تھی۔ انھوں نے کشمیر کی صورت حال کے بارے میں حکومت ہند کو جو رپورٹ دی، اس کے پیش نظر الحاق کی درخواست کو قبول کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

"شیخ صاحب بھی وہی کہتے ہیں"

ہول ناک حالات میں بھی اکثر ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جو سپاٹ اور بے رنگ ماحول کی یکسانیت کو درہم برہم کر کے کم از کم وقتی طور پر تھوڑا سا تنوع پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی نوع کا ایک واقعہ اس موقع پر بھی مہر چند مہاجن کے ساتھ دہلی میں پیش آیا۔ کشمیر کی صورت حال کی نزاکت کا جتنا اندازہ انھیں تھا، کسی اور کو نہیں ہو سکتا تھا، اور اس سے وہ جس قدر پریشان تھے، کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کشمیر کو فوری طور پر فوجی امداد بھیجنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے جواہر لال نہرو سے کہا:

"فوج دیجئے، الحاق کیجئے، اور جو بھی اختیارات چاہئے، عوامی پارٹی

[نیشنل کانفرنس] کو دیجئے، لیکن آج ہی ہوائی جہاز سے فوج سری نگر بھیجئے، ورنہ میں جاکر جناح سے مصالحت کی بات کروں گا، کیوں کہ سری نگر شہر کو بچانا ہے۔"[1]

جواہر لال نہرو بھلا ایسی باتوں کی تاب لانے والے کہاں تھے۔ یہ سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئے، اور مہر چند مہاجن کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مسٹر مہاجن ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ بغل کے کمرے سے چپراسی نے ایک کاغذ لاکر جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں دیا۔ یہ شیخ عبداللہ کا پیغام تھا جو اس وقت ان ہی کے یہاں ٹھہرے تھے اور بغل کے کمرے میں بیٹھے یہ باتیں سن رہے تھے۔ اس پرزے کو پڑھ کر جواہر لال نہرو کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور انھوں نے مہر چند مہاجن سے کہا کہ آپ کی جو رائے ہے "شیخ صاحب بھی وہی کہتے ہیں"۔ مسٹر مہاجن نے لکھا ہے کہ "ایسے آڑے موقع پر شیخ عبداللہ کی مدد کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا"، کیوں کہ انھوں نے بر وقت پیغام بھیج کر "کشمیر کو پاکستان کے ہاتھ میں جانے سے بچالیا"۔[2]

ایک عظیم غلطی

ہندستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی درخواست کو قبول کرنے کے بعد ہندستان کے دستوری سربراہ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجا کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے، ایک خط میں، یہ بھی لکھا کہ:

---

[1] Mahajan : *Accession of Kashmir to India*, p. 16

[2] ایضاً



۱۹۴۷ء کے پاکستانی جلسے کے دوران لال چوک (سری نگر) کا ایک منظر

"جن مخصوص حالات کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کے پیش نظر میری حکومت ہندستانی ڈومینین کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو قبول کرتی ہے۔ اس اصول کے تحت کہ جس ریاست میں الحاق کا مسئلہ مابہ النزاع ہو وہاں الحاق کا فیصلہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق ہونا چاہیئے، میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جوں ہی امن و امان بحال ہو اور حملہ آوروں سے ریاست کو نجات ملے، تو ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے سے طے کیا جائے[1]۔"

یہ خط، جو بہت سے حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ذمے دار ہے، الحاق کی دستاویز کا جزو نہیں تھا۔ اس کا ازالہ کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے لوک سبھا میں کہا تھا:

"ہندستان کے ساتھ [کشمیر کے] الحاق کے سلسلے میں ایک بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں، جس کی بابت بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ چند روز ہوئے میں نے ایوان میں کہا تھا کہ الحاق قانونی و واقعاتی اعتبار سے مکمل تھا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے، جس کے لئے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہے ۔۔۔ یہ ہر شبہ اور اعتراض سے بالاتر ہے[2]۔"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے متذکرہ بالا خط سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی، اس کا جواہر لال نہرو اور دوسرے ذمے داروں نے ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں بار ازالہ کیا مگر:

---

[1] Campbell-Jhonson : *Mission With Mountbatten*, p. 225.

[2] تقریر لوک سبھا۔ ۷ اگست ۱۹۵۲ (کارروائی لوک سبھا۔ جلد ۴ حصہ ۲ کالم ۸۳۔ ۸۲ء)

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہندستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق جن حالات میں عمل میں آیا تھا ان کے پیش نظر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خط میں عوام کی رائے سے الحاق کا فیصلہ کرنے کی شق این. سی. چٹرجی، ممبر پارلیمنٹ (مخالف پارٹی) کے الفاظ میں "غیر ضروری ہی نہیں بلکہ غیر دانش مندانہ بھی تھی[1]" جس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر پر پاکستانی حملے کے بعد پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا سوال قانونی و اخلاقی دونوں اعتبار سے خارج از بحث تھا۔ رہا کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کا سوال۔ اس کا جواب بھی کشمیری عوام منظفر آباد سے لے کر سری نگر تک حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے دے چکے تھے۔ کشمیری عوام کو اگر پاکستان کے ساتھ جانا منظور ہوتا تو حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی جگہ پر وہ انھیں خوش آمدید کہتے۔

ہمارے اسی غیر دانش مندانہ اقدام کی آڑ لے کر کشمیری عوام مطالبہ کرتے ہیں کہ "کشمیر ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے"۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہ نعرہ صرف ان ہی کشمیریوں کا نہیں ہے، جو پاکستانی ذہن کے مالک ہیں اور جو کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہی مطالبہ شیخ عبداللہ کا بھی ہے، جو اور جو کچھ بھی چاہتے ہوں کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا ہرگز پسند نہ کریں گے، اور جنھیں ۸ اگست ۱۹۵۳ء کی شام تک، پاکستان کی حکومت، پاکستان کی عوامی قیادت اور پاکستان کے اخبارات "ہندستان کا پٹھو" اور "پاکستان کا دشمن نمبر ایک" کہتے اور سمجھتے بھی تھے۔

---

[1] تقریر لوک سبھا ۲۶ جون ۱۹۵۲ء (کارروائی لوک سبھا۔ جلد ۲ حصہ ۲ کالم ۲۵۲۹)

شیخ عبداللہ اور الحاق

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء میں، اور اس کے بعد بھی ایک مدت تک شیخ محمد عبداللہ بھی "عوام کی رائے معلوم کرنے" کی شق کو غیر ضروری سمجھتے تھے، اور ہندستان کے ساتھ غیر مشروط الحاق کے حامی و خواہش مند تھے۔ ۱۹۵۸ء میں اپنی رہائی کے بعد ایک تقریر میں انھوں نے اس کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ جواہر لال نہرو سے انھوں نے بارہا کہا کہ:

"اس عارضی الحاق کو قطعی و دائمی شکل دے دیجئے[1]"

لیکن جواہر لال نہرو کی حکومت چوں کہ پہلے ہی دن ایک غلط قدم اٹھا چکی تھی، اور اقوام متحدہ میں بھی اس کا اعادہ کیا جا چکا تھا، اس لئے یہ غلطی ہر قدم پر ان کے لئے زنجیر پا بن گئی۔

---

[1] تقریر حضرت بل: ۱۳ جنوری ۱۹۵۸

ہندستان کے ساتھ کشمیر کے "عارضی الحاق کو قطعی اور دائمی شکل" دینے کی جو تڑپ شیخ عبداللہ کے اندر ۱۹۴۷ء میں تھی، اور جو ۱۹۵۲ء کے اواخر تک شاید برقرار بھی رہی، ۱۹۵۳ء میں یقیناً اس میں کمزوری آگئی تھی۔ اس کا پہلا مظاہرہ انھوں نے ۱۹۵۳ء کے اوائل میں حیدرآباد میں کیا، جہاں اس وقت کانگرس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے اپنا ذہن کھول کر تو نہیں رکھا تھا، لیکن ان کا اندازِ بیان اور ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس کی غمازی کر رہا تھا کہ ہندستان کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور روزافزوں رجعت پرستی کا مقابلہ کرنے کی سکت اب ان میں رہی نہیں ہے، اور اس کے آگے انھوں نے سپر ڈال دی ہے۔ آزادی کے بعد کی ہندستانی قومی سیاست کا یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس شکست کے احساس نے، قدرتی طور پر، شیخ عبداللہ کے اندر بھی ایک طرح کی جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ ان کا یہ مبہم جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے:

"ہم [کشمیریوں] نے تو اپنی راہ متعین کر لی ہے، اب خود ہندستان کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کون سی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔"

شیخ عبداللہ نے اس تقریر میں اگرچہ اس کی وضاحت نہیں کی تھی

کہ وہ کون سی راہ ہے جو کشمیر نے اپنے لئے "متعین کر لی ہے۔" لیکن ان کی تقریر سننے کے بعد میرا ہی نہیں، بلکہ شاید سب ہی سننے والوں کا یہی احساس تھا کہ شیخ صاحب اپنی اس ڈگر سے ہٹ گئے ہیں، جس پر اب تک وہ چل رہے تھے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوس ناک حقیقت یہ ہے، جس کی طرف کسی نے بھی دھیان نہیں دیا تھا، کہ شیخ عبداللہ کو اس وقت آسانی سے پرانی ڈگر پر واپس لایا جا سکتا تھا۔ میرا تو آج بھی گمان ہے کہ شیخ عبداللہ کے اور عام ہندستانیوں کے تصورات میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور بعض صاحب غرض لیڈر ہم سے ان کی جس درجہ دوری کا ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں، وہ اس درجہ ہم سے دور نہیں ہیں۔

ابھی حال ہی میں نیشنل کانفرنس کے لیڈر اور کشمیر کے سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے سری نگر کے پریس کلب میں کہا تھا کہ حکومت ہند نے شیخ عبداللہ کو رہا کیا تو نیشنل کانفرنس سیاسی سطح پر ان کا مقابلہ کرے گی۔ اس سلسلے میں بخشی صاحب سے بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا تھا، جو افسوس ہے کہ نہیں کیا گیا، کہ انھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں عموماً، اور اس دور میں خصوصاً، جب کہ خود بخشی صاحب ہی نے ساڑھے تین ماہ کے لئے انھیں رہا کیا تھا، سیاسی سطح پر انھوں نے شیخ عبداللہ کا مقابلہ کیوں نہیں کیا تھا؟

شیخ عبداللہ کی ذہنی تبدیلی کے محرکات

کشمیر اور ہندستان کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں شیخ عبداللہ کے خیالات میں جو تبدیلی ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئی، اس کے حقیقی محرکات کیا

تھے؟ شیخ عبداللہ کو، ان کے نظریات میں تبدیلی کا الزام دینے سے پہلے، اس سوال پر ہم نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ہے، جو ہمیں یقیناً کرنا چاہیے تھا۔ اس سلسلے میں، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک کے حالات کا ہمیں جائزہ لینا ہوگا۔

یہ حقیقت ہے کہ تقسیم سے پہلے کانگریس ہمارے ملک کی سب سے بڑی غیر فرقہ وارانہ سیاسی پارٹی تھی، اور ملک کی آزادی کانگریس کی جد و جہد اور ہندستانی عوام کی ان قربانیوں کا نتیجہ تھی، جو انھوں نے کانگریس ہی کے جھنڈے تلے دی تھیں۔ لیکن یہ بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے کہ ملک جن حالات میں تقسیم ہو کر آزاد ہوا تھا، اس نے کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار کو کم زور ہی نہیں کیا، بلکہ ہندو فرقہ پرستی کے رجحانات کو، جو ملک میں اور خود کانگریس کے ایک طبقے میں پہلے ہی سے موجود تھے، مضبوط تر کر دیا۔ ان ہی حالات نے، جن پر کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ عناصر کو قطعاً قابو نہیں تھا، جن سنگھ اور اس کے عسکری بازو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کو، جو نازی طور طریقوں کا حامل تھا، جنم ہی نہیں دیا بلکہ کانگریس کا حریف بنا دیا۔ دوسری طرف تقسیم سے پیدا ہونے والے حالات نے کانگریس کی نچلی سطح اور نچلی سطح کی لیڈر شپ ہی کا نہیں، بلکہ بالائی لیڈر شپ کے ایک حصے کا ذہن بھی مسموم کر دیا۔ کانگریس کے اس گروہ کی عملی ہمدردیاں اگر علانیہ نہیں تو در پردہ یقیناً جن سنگھ کے لئے وقف تھیں۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور ان ہی جیسے کچھ اور لوگ بھی کانگریس کی مرکزی حکومت میں وزیر تھے، جو کانگریس کے نہیں بلکہ جن سنگھ کے نمائندے تھے۔

سردار پٹیل، جواہر لال نہرو اور گاندھی جی

۱۹۴۷ء سے بہت پہلے بھی کانگریس داہنے اور بائیں بازوؤں میں بٹی تھی۔ پہلا سردار پٹیل کا اور دوسرا جواہر لال نہرو کا گروہ تھا۔ تقسیم کے بعد کانگریس کے ان دونوں بازوؤں کے خد و خال اور زیادہ واضح ہو گئے۔ سردار پٹیل کو ہندستان کا مردِ آہن کہا جاتا تھا، اور وہ تھے بھی۔ بڑے مضبوط دل و دماغ کے انسان۔ بعض حلقوں میں ان کے بارے میں یہ غلط فہمی بھی تھی، اور آج بھی ہے، کہ وہ فرقہ پرست تھے۔ لیکن حقیقتاً وہ فرقہ پرست تھے نہیں۔ البتہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کانگریس ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں — ایک خود ان کی اور دوسری جواہر لال نہرو کی۔ وہ، قدرتی طور پر، ہر اس شخص کے دشمن تھے جو جواہر لال کی پارٹی میں تھا۔ مسلمان عام طور پر جواہر لال ہی کو اپنا ماویٰ و ملجا سمجھتے تھے، اور من حیث الجماعت ان ہی کی پارٹی میں تھے، اس لئے سردار پٹیل مسلمانوں کے بھی اتنے ہی دشمن تھے، جتنے اس ہندو کے تھے، جو جواہر لال نہرو کی پارٹی میں تھا۔

سردار کے ساتھ بھی کچھ مسلمان تھے — خصوصاً صوبہ بمبئی کے، اور ان کے علاوہ کچھ سابق مسلم لیگی بھی تھے، جو تقسیم کے بعد اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر پاکستان نہیں جا سکے تھے، اور اب انھوں نے مسلم لیگ کا جامہ اتار کر، بلا غسل کئے ہوئے، کانگریس کا چولا بدل لیا تھا۔ ان سب کے ساتھ سردار کا رکھ رکھاؤ وہی تھا، جو اپنے اور ساتھیوں کے ساتھ تھا، لیکن عام مسلمانوں کے اور جواہر لال نہرو کے باب میں ان کا جو نظریہ تھا، اس کا

اندازہ اسی لطیفے سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ہندستان میں اب کتنے نیشلسٹ مسلمان ہیں؟" کسی نے تقسیم کے کچھ ہی دنوں بعد سردار سے سوال کیا۔

"صرف ڈیڑھ" انھوں نے فی البدیہ جواب دیا "ایک جواہرلال نہرو اور آدھا ابوالکلام آزاد"

کشمیریوں کے باب میں عموماً اور شیخ عبداللہ کے باب میں خصوصاً سردار پٹیل کی، بجا طور پر، رائے یہی تھی کہ وہ جواہرلال کی پارٹی میں ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر کشمیریوں کے بارے میں بھی ان کا وہی خیال اور وہی رویہ تھا جو عام ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں تھا۔ کشمیری مسلمانوں میں انھیں بخشی غلام محمد میں یقیناً کشش نظر آئی تھی، جس کی تہ میں بخشی غلام محمد کی "توانا قوم پرستی" سے زیادہ ان کے کردار کی بعض خصوصیات کارفرما تھیں، جنھیں سردار کی دوربین نگاہوں نے پہلے ہی دن بھانپ لیا تھا۔

سیاست کی دنیا بھی بڑی نرالی اور انوکھی دنیا ہے، جہاں کبھی کبھی متضاد عناصر کو بھی مشترک حریف کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کا حلیف بننا پڑتا ہے۔ چناں چہ داہنے بازو کے کانگرسیوں کے علاوہ فرقہ پرست ہندو عناصر بھی، جو سردار ہی کی طرح ملک کی داخلی سیاست میں جواہرلال نہرو کی اقلیت دوستی اور سوشلزم کو، اور خارجی پالیسی میں سوشلسٹ ملکوں کی طرف ان کے جھکاؤ کو اپنے جماعتی مفاد کے منافی سمجھ رہے تھے، سردار کے گرد جمع ہو گئے۔ ان سب کو جواہرلال کی کشمیر پالیسی سے بھی یک سر اختلاف تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کشمیر کو بھی، ملک کی اور ریاستوں کی طرح، جلد سے جلد مکمل طور پر ہندستان میں ضم کر لینے کے درپے تھے

اور اسی کو ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھ رہے تھے۔

سردار پٹیل تقسیم سے قبل، گاندھی جی کے آدمی سمجھے جاتے تھے لیکن تقسیم کے بعد فرقہ دارانہ معاملات ہی نے ان دونوں میں بھی اتنی دوری پیدا کر دی تھی کہ سردار، گاندھی جی کو بھی جواہرلال نہرو ہی کا آدمی سمجھنے لگے تھے۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں پرارتھنا کے بعد جو تقریریں کی تھیں، اور جو شایع بھی ہو چکی ہیں، ان میں گاندھی جی اور سردار کے اختلافات کے واضح نشانات ہی نہیں بلکہ عریاں ثبوت بھی ملتے ہیں[1] اب تو گاندھی جی کی شہادت کے بارے میں بھی یہ خیال کھل کر ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ اس کی ذمے داری اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ سردار پٹیل ہی پر بھی، جو اس وقت ہندستان کے ہوم منسٹر تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ گاندھی جی کے بعد سردار پٹیل بھی زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکے۔ مولانا آزاد کا تو خیال تھا کہ گاندھی جی کی شہادت کی ذمے داری کے احساس ہی کا روگ سردار کو کھا گیا[2]

کانگرس کے داہنے بازو کی مضبوطی

سردار پٹیل کی وفات کے بعد جواہرلال نہرو کا ایک حریف تو یقیناً میدان سے اٹھ گیا، لیکن کانگرس کی تنظیم اور حکومت دونوں میں سردار کی وفات سے جواہرلال کے ہاتھ مضبوط نہ ہو سکے، جس کی وجہ یہ تھی کہ کانگرس

---

[1] دیکھئے — Delhi Diary مرتبہ پیارے لال

[2] مولانا آزاد — "India Wins Freedom" ص ۲۲۵

کا یہ بازو سرداری کی زندگی میں اس درجہ مضبوط ہو چکا تھا کہ اس پر قابو حاصل کرنا جواہر لال نہرو کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کشمیر کے بارے میں بھی کانگرس کے اس بازو کے تصورات جن سنگھ سے مختلف نہیں تھے، اور یہ 'اندرونی طور پر'، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی ہی کا ہم نوا تھا، جو سردار کی زندگی ہی میں، بلکہ ان ہی کے اشارے پر، نہرو لیاقت معاہدے کے وقت کانگرس سے الگ ہو چکے تھے۔

ہمارے دستور میں کشمیر کی مخصوص حیثیت اور اس کی مُخالفت

ہندستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق تمام ریاستوں کی طرح صرف دفاع، امور خارجہ، اور رسل و رسایل ہی کے تین محکموں تک محدود تھا۔ اندرونی طور پر ریاست کو مکمل خود مختاری حاصل تھی۔ سردار پٹیل نے ملک کی عام ریاستوں کے حکم رانوں کو سمجھا بجھا کر اس کے لئے تیار کر لیا تھا کہ ان کی ریاستیں مکمل طور پر انڈین یونین میں ضم ہو جائیں۔ یہ سردار پٹیل کا ایک عظیم کارنامہ ہے، جسے کوئی بھی ایمان دار مورخ نظر انداز نہ کر سکے گا۔ کشمیر کے بارے میں بھی توقع یہی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب ملک کی اور ریاستوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر بھی انڈین یونین میں برابر کی شریک ہو گی۔ لیکن کشمیر کے مخصوص حالات اور مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی نوعیت کی وجہ سے فوری طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔ اگر چہ جن سنگھ اور اس کے "ہم سفروں" کی خواہش یہی تھی کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ چناں چہ یہ آواز اس وقت بھی اٹھی تھی جب کشمیر کی مخصوص حیثیت کو ہمارے دستور میں جگہ دی گئی تھی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی ہی نے، آگے چل کر،

پارلی منٹ میں تقریر کرتے ہوئے حکومت ہند کو یاد دلایا تھا کہ:

"دستور ساز اسمبلی میں جب یہ مخصوص دفعہ [۳۷۰] پیش کی گئی تھی تو آنر ایبل ممبروں نے ٹوکا تھا کہ ـــ کشمیر کے ساتھ یہ خصوصی برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے؟' اور گوپال سوامی آینگر [وزیر امور کشمیر] نے اس کے جواب میں جو کہا تھا، وہ یہ ہے:

"یہ خصوصی برتاؤ کشمیر کے مخصوص حالات کا نتیجہ ہے۔ یہ ریاست ابھی ضم کئے جانے کے قابل نہیں ہوئی ہے۔ ہر شخص کی یہ توقع ہے کہ آگے چل کر ریاست جموں و کشمیر بھی اس قابل ہو جائے گی کہ وہ بھی اسی طرح ضم ہو جائے. جس طرح اور ریاستیں ہوئی ہیں۔ (تالیاں)'

"ان کے اس بیان کے بعد [دستور ساز اسمبلی کی کارروائی میں] لفظ 'تالیاں' بھی درج ہے، جو بظاہر کانگرس ہی کے ممبروں نے بجائی ہوں گی، جن میں سے بہت سے ممبر آج شیخ عبداللہ کے اس حق پر اعتراض کر رہے ہیں کہ تین معاملات [دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسایل] کے علاوہ [کشمیر] ہندستان سے الگ رہے گا[5]۔"

ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے مندرجہ بالا اقتباس سے میرے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہے کہ جن سنگھ کے ساتھ ساتھ کانگرس کے داہنے بازو کی خواہش و کوشش تھی کہ وقت کا انتظار کئے بغیر، بلا تاخیر،

---

۵ کارروائی لوک سبھا: ۲۶ جون ۱۹۵۲: کالم ۲۵۰۷

ریاست جموں و کشمیر کو ہندستان میں مکمل طور پر ضم کر لیا جائے۔

کشمیر کے مکمل انضمام کی اہم ترین شرط

ریاست جموں و کشمیر کو مکمل طور پر ہندستان میں ضم کرنے کی خواہش بڑی حد تک قدرتی تھی اور اس کے بر لانے کی کوشش میں بھی کوئی برائی نہیں تھی۔ اس معاملے میں کانگرس کا بایاں بازو ہی نہیں بلکہ ملک کے تمام ترقی پسند عناصر بھی ساتھ دے سکتے تھے۔ لیکن کانگرس کے بائیں بازو اور ملک کے ترقی پسند عناصر کو اور ان سب سے زیادہ جواہر لال نہرو کو اس کا علم تھا کہ ہندستان کے ساتھ کشمیر کو مکمل طور پر ضم کرنے کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس کی خواہش اور تڑپ خود کشمیریوں کے اندر پیدا ہو۔ کشمیر ہی کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے ایک کانگرسی ممبر پارلیمنٹ مسٹر چندا نے کہا تھا:

"یہ سچ ہے کہ ہم سب نے یہ پسند کیا ہوتا کہ کشمیر کا الحاق بھی بالکل اسی طرح ہو، جس طرح اور ریاستوں کا ہوا ہے، اور ہماری یہ پر خلوص توقع ہے کہ وہ دن آنے ہی والا ہے، جو بہت دور بھی نہیں ہے، جب کشمیر بھی ہندستان میں اسی طرح ضم ہو جائے گا جیسے کہ اور ریاستیں ہوئی ہیں"

مسٹر چندا کا یہ جملہ سن کر ہندو مہاسبھائی ممبر پارلیمنٹ مسٹر این۔ بی۔ کھرے نے طنزاً "آمین" کہا۔ ان کے آمین کہنے کا "شکریہ" ادا کرتے ہوئے مسٹر چندا نے اضافہ کیا:

"لیکن ہم جبر اور زبردستی سے ایسا نہیں کر سکتے... مخالف پارٹی کے جو ممبران شیخ عبداللہ اور ان کی حکومت پر شدید اور غیر دانش مندانہ

نکتہ چینی کر کے ہندستان کے ساتھ کشمیر کا مکمل الحاق کرنا چاہتے ہیں، وہ اس عمل سے اپنے ہی مقصد کو نقصان پہنچا رہے ہیں... آج سب سے زیادہ ضرورت صبر و تحمل کی اور جمہوریت پر اعتقاد رکھنے کی ہے"[1]

کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ مسٹر اے۔ کے۔ گوپالن نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ:

"کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور ہمیں انھیں یقین دلانا چاہئے کہ اگر وہ ہندستان کا حصہ بن جائیں تو اس میں ان کا فایدہ ہے"[2]

ان ہی حقایق کو جواہر لال نہرو نے، بحث کا جواب دیتے ہوئے، اپنے مخصوص انداز میں واضح تر الفاظ میں بیان کیا تھا:

"مضبوط ترین رشتے جو [کشمیر کو ہندستان سے] وابستہ کریں گے نہ تو آپ کی فوجیں ہوں گی، اور نہ آپ کا وہ دستور ہی ہوگا، جس کی اس ایوان میں بہت دہائی دی گئی ہے، وہ رشتے تو انس و محبت اور رواداری کے ہوں گے جو دستور سے، قوانین سے اور فوجوں سے قوی تر ہوتے ہیں"[3]

مسئلہ کشمیر کے اسی مباحثے کے دوران ایوان میں جو زہریلی تقریریں

ـہ ۱ تقریر لوک سبھا: ۷؍ اگست ۱۹۵۲ء: کالم ۵۸۰۰

ـہ ۲ ایضاً ایضاً کالم ۵۸۰۲

ـہ ۳ ایضاً ایضاً کالم ۵۸۹۹

ہوئی تھیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت شیو نرائن فوتے دار نے، جو کشمیر کے نمائندے تھے، یہ بڑی پتے کی بات کہی تھی کہ :

"مسٹر جناح، جن کے ساتھ کشمیری مسلمانوں نے، ان کے نظریات کی بنا پر، ۱۹۴۴ء میں بدسلوکی کی تھی، اپنی زندگی میں، کشمیر کے سلسلے میں، دو باتوں کے آرزومند تھے۔ ایک تو یہ کشمیر کو ہندستان سے دور رکھا جائے، اور دوسرے یہ کہ عبداللہ ازم کا نام و نشان نہ رہے۔ جناح کی جو آرزو ان کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی تھی، مسلم لیگ اور پاکستان کو ـــــ حملہ کرنے کے بعد بھی، جو کچھ نصیب نہ ہو سکا تھا ... میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اس ایوان میں جمہوریت کا نام لے کر، ہندستان کا نام لے کر، بھارت کا نام لے کر پاکستان کو وہ سب کچھ دیا جا رہا ہے، اور اس طرح سے مسٹر جناح کی محترم روح کو پر خلوص خراج سرائی کا نذرانہ پیش کیا جا رہا ہے ...

"دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
"اس گھر کو لگ گئی آگ گھر کے چراغ سے[1]"

---

[1] تقریر لوک سبھا: ۷؍اگست ۱۹۵۲ء: کالم ۵۸۹۹

شیخ عبداللہ سے ایک ملاقات

اگست ۱۹۵۲ء تک شیخ عبداللہ کے ذہن میں کوئی بنیادی تبدیلی تو یقیناً نہیں آئی تھی، لیکن ان سے باتیں کرنے کے بعد، ان کے پیروں میں لغزش پیدا ہونے کا ایک مبہم سا احساس میرے اندر ضرور پیدا ہوا تھا۔

مرکزی مُلازمتیں اور کشمیری مسلمان

"میں نے آج کل گورنمنٹ آف انڈیا کی گردن دبائی ہے،" دورانِ گفتگو میں انھوں نے کہا" میں نے ان سے پوچھا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے لے کر اِس وقت تک اُن محکموں میں کتنے کشمیری مسلمان لئے گئے ہیں، جو یونین کے پاس ہیں[۱]"

شیخ عبداللہ کے اِس جملے کا ایک ایک لفظ ان کے ذہنی پیچ و تاب ہی کی نہیں بلکہ ان کے فکری رجحان کی بھی غمازی کر رہا ہے۔ کشمیری

---

[۱] شیخ عبداللہ کا یہ جملہ راقم نے ایک صحبت میں دہرایا تو مولانا آزاد مرحوم کے سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خاں نے، جو اس صحبت میں شریک تھے، بتلایا کہ یہی جملہ شیخ عبداللہ نے مولانا آزاد کو بھی ایک خط میں لکھا تھا۔

"ہندستان سے جو بھی دوست آئے، ان سے میں نے گھنٹوں کشمیر کے حالات پر تبادلۂ خیال کرنے میں خوشی محسوس کی ہے"

شیخ عبداللہ

(مکتوب بنام مولانا محمد سعید مسعودی)

مسلمانوں اور شیخ عبداللہ کی ہم سے دوری کا ایک اہم سبب ملازمتوں کا سوال بھی تھا۔ اس کا شکار اس وقت کشمیری ہی نہیں بلکہ ہندستانی مسلمان بھی تھے، جنھیں سرکاری ملازمتوں سے بالارادہ محروم کیا جاتا تھا۔ اس کا وار کشمیری مسلمانوں پر بھی چلتا تھا۔ دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسایل کے ان محکموں میں کشمیری مسلمانوں کو ملازمتیں نہیں مل رہی تھیں، جو ریاست جموں و کشمیر نے انڈین یونین کو سونپے تھے۔

خفیہ سرکلر

گورنمنٹ آف انڈیا کی اس پالیسی کا، قدرتی طور پر، شیخ عبداللہ کے ذہن پر گہرا اثر تھا۔ اپنی پہلی رہائی (۱۰ جنوری ۱۹۵۸ء) کے دوسرے دن کُد کے پر فضا ڈاک بنگلے میں اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے، اور باتوں کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ:

"۱۹۴۷ء میں ہندستان کے ساتھ الحاق میں نے گاندھی جی کی تعلیمات اور ان کے پروگرام کے تحت کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہندستان میں [کشمیری] مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ و فیاضانہ سلوک کیا جائے گا، مگر بدقسمتی سے میں انھیں ان کا حق بھی نہ دلوا سکا۔۔ حصول آزادی کے بعد ریاستی فوج پر جب ہندستان کا کنٹرول ہو گیا تو ریاست میں فوجی بھرتی کے سلسلے میں ایک خفیہ سرکلر جاری کیا گیا، جس میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہ کیا جائے۔ یہ بات جموں کے مقام پر، اس وقت کے وزیر دفاع، مسٹر گوپال سوامی آینگر کے علم میں لائی گئی، تو انھوں نے اس سرکلر کے اجرا سے انکار کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس قسم کا سرکلر

آئین ہند کی روح اور اس کے معانی کے منافی ہے[۵۱]۔ بخشی غلام محمد اور مولانا سعید مسعودی نے بھی اس [سرکلر] کی تصدیق کی۔ جب [گوپال سوامی آینگر سے] میں نے پوچھا کہ ریاستی فوج پر کنٹرول کے بعد بھرتی کے دوران مختلف فرقوں کا کیا تناسب رہا ہے تو اس کا کوئی جواب مسٹر آینگر نے نہ دیا۔

"اسی طرح جو بھی محکمے ہندستان نے اپنے ہاتھ میں لیے، ان سب میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا، اگرچہ کشمیر کے غیر مسلموں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا گیا۔ یہ باتیں میں نے حکومت ہند اور پنڈت نہرو کے سامنے بھی رکھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان باتوں کو عوام کے سامنے لاؤں، مگر میری ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔۔۔[۵۲]"

ملک اس وقت جس مہیب فرقہ پرستی کے طوفان سے گزر رہا تھا۔ اس کا شیخ عبداللہ سے زیادہ شاید ہی کسی کو علم رہا ہو گا۔ چناں چہ اس دور میں کشمیری مسلمانوں کا سرکاری ملازمتوں میں نظر انداز کیا جانا ایک ایسا معاملہ تھا کہ شیخ عبداللہ بھی اس پر ٹھنڈے دل سے اگر غور کرتے تو اس شکایت میں جان ہونے کے باوجود، یہ یقیناً زیادہ وزنی ثابت نہ ہوتی۔ مسلمانوں کو، خواہ وہ کشمیر کے ہوں یا ملک کے کسی بھی حصے کے، صرف مسلمان ہونے کی بنا پر سرکاری ملازمتوں سے محروم کیا جانا اکثریت کی فرقہ پرستی کا ایک ایسا

---

[۵۱] گوپال سوامی آینگر کی یہ توضیح یقیناً صحیح تھی، اور عین ممکن ہے کہ اس سرکلر کے اجرا کا ان کو علم نہ رہا ہو۔ لیکن اس کی تحقیق انھیں کرنی چاہیے تھی، جو معلوم نہیں انھوں نے کی تھی یا نہیں!

[۵۲] ہفتہ وار "سچ" (جموں): ۱۷ جنوری ۱۹۵۸ء

رجحان تھا، جس پر کڑھنے، روٹھنے اور احتجاج کرنے سے زیادہ اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اور یہ کام اس وقت پورے ملک میں شیخ عبداللہ سے زیادہ اور ان سے بہتر کوئی دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی ان سے توقع بھی تھی کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے اواخر اور ۱۹۴۸ء کے اوائل میں جب انسان نے پورے برصغیر میں، اپنی آدمیت کو بالائے طاق رکھ کر درندگی کا جامہ پہن لیا تھا، اور ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا تو اس وقت، کشمیر کے الحاق کے ساتھ ہی شیخ عبداللہ کی ذات فرقہ پرستی کی اندھیری رات میں روشنی کا منارہ بن کر نمودار ہوئی تھی۔

شیخ عبداللہ بھی، "پیالہ و ساغر نہیں"، انسان ہی ہیں۔ گردش و پیش کے حالات سے یک سر متاثر نہ ہونا ان کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں پرجا پریشد کی تحریک نے جموں میں سر اٹھایا۔ یہ خالص فرقہ وارانہ تحریک تھی۔ اس کا سلسلہ ۱۹۵۳ء کے اوائل تک جاری رہا۔ بہ ظاہر اس کی قیادت جموں کی پرجا پریشد کر رہی تھی لیکن عملاً اس کی باگ ڈور "جن سنگھ اور داہنے بازو کی دوسری پارٹیوں کے ہاتھ میں تھی"[1]۔ کانگرس کے داہنے بازو کی بھی اسے پوری حمایت و ہم دردی حاصل تھی۔ اس وقت پورے ملک میں فرقہ پرستی اور رجعت پرستی کو جو بالادستی حاصل ہوگئی تھی اس نے ملک کے غیر فرقہ پرست اور ترقی پسند عناصر کو عموماً اور کانگرس کے بائیں بازو کی قیادت کو خصوصاً اس درجہ بے بس کر دیا تھا کہ پرجا پریشد کی اس خالص فرقہ وارانہ تحریک کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی ان میں سکت

---

[1] Siair Gupta : *Kashmir*, p. 381

نہیں رہی تھی۔ شیخ عبداللہ کے ذہن پر اس صورتِ حال کا شدید ردِّ عمل ہوا۔ مولانا سعید مسعودی نے لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے، بجا طور پر سوال کیا تھا کہ:

"ہندستان کے کچھ لوگوں کی طرف سے۔۔۔ ہمارے ہی بھائی اور ہمارے ساتھیوں کے ایک چھوٹے سے حصے کی طرف سے، آنکھیں بند کر کے اور بلا سوچے سمجھے، جموں کے اس ٹولے [پرجا پریشد] کی تائید شروع ہو جائے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟[1]"

جواہر لال نہرو نے پرجا پریشد کی تحریک کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اس افسوس ناک تحریک نے [کشمیر کے بارے میں] ہماری بنیادی نظریے پر کاری ضرب ہی لگانے کی کوشش نہیں کی ہے، اور صرف انتشار ہی نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا شدید ردِّ عمل بھی ہوا ہے، خصوصاً وادیٔ کشمیر میں[2]۔"

لیکن جواہر لال کی یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔

فرقہ پرستی کی یہ وبا!

شیخ عبداللہ سے اپنی جس ملاقات کی طرف اس باب کے آغاز میں میں نے اشارہ کیا تھا، اور جو ان سے میری پہلی اور آخری تفصیلی ملاقات

---

[1] تقریر لوک سبھا: ۷ اگست ۱۹۵۲ء: کارروائی لوک سبھا جلد ۴ حصہ دوم، کالم ۵۸۳۷
[2] کارروائی لوک سبھا: ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء

تھی، کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ اور باتوں کے علاوہ، اس ملاقات میں ملک میں فرقہ وارانہ رجحانات کی روز افزوں ترقی پر بھی انھوں نے گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اس وقت تک جموں میں پرجا پریشد کی تحریک نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ شیخ عبداللہ کے تجزیہ کے مطابق فرقہ پرستی کے چکر میں ہندو و مسلمان دونوں یکساں مبتلا تھے، اور اس فانوس میں دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔

"مجھے تو یہ دیکھ کر اور بھی دکھ ہوتا ہے" شیخ عبداللہ نے کہا کہ "یہ وبا مسلمانوں میں بھی بڑھتی جا رہی ہے، اگرچہ یہ ہندو فرقہ پرستی ہی کا ردِ عمل ہے۔ ہمارے کشمیری مسلمان تاجر جو ہندستان جاتے ہیں، انھیں اکثر ہندستانی مسلمان کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، جو بہت عجیب مشورہ، اور اپنے پیر پر کلاڑھی مارنے کے مرادف ہے۔"

آزاد کشمیر ـــــ ناممکن!

شیخ عبداللہ نے دیر تک مسئلہ کشمیر پر بھی باتیں کیں، جو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ انھوں نے کشمیر اور پاکستان کے بنیادی تضاد کو واضح کرتے ہوئے بتلایا کہ کشمیر کی جدوجہد آزادی کی تحریک قطعاً سیکولر تھی، اس کے برعکس قیامِ پاکستان کے محرکات یک سر مذہبی تھے۔ انھوں نے "نیا کشمیر" کے پروگرام کا بھی ذکر کیا، جو خالص سوشلسٹ اصولوں پر مبنی ہے، اور پاکستان کا مزاج اس پروگرام سے قطعاً لگا نہیں کھاتا۔

مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ عبداللہ

نے کہا کہ ایک حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ بندی کی موجودہ لائین کو ہندستان و پاکستان کی بین الاقوامی سرحد تسلیم کر لیا جائے۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ پاکستان میں بھی شاید اسی ڈھنگ سے آج سوچا جا رہا ہے اور پاکستانی ذہن جنگ بندی لائین پر سمجھوتہ کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے۔

اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے بتایا کہ "سرحد پار سے آج کل کچھ کشمیری طالب علم آئے ہیں، جو مجھ سے بھی ملے تھے۔ یہاں آنے سے قبل گرومانی نے [جو اس وقت پاکستان میں وزیر امور کشمیر تھے] ان طالب علموں کو چائے پر بلایا تھا۔ مسئلہ کشمیر پر ان سے باتیں کرتے ہوئے گرومانی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ موجودہ جنگ بندی لائن کو، کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ مستقل شکل دی جا سکتی ہے۔"

مسئلہ کشمیر پر باتیں کرتے کرتے شیخ صاحب نے کوئی اور موضوع چھیڑا تو، قطع کلام کی معافی مانگتے ہوئے، میں نے کہا:

"اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت اور بھی ہو سکتی ہے، جو آپ نے شاید نظر انداز کی ہے۔"

"وہ کون سی صورت ہے؟" انھوں نے سوال کیا

"آزاد کشمیر" میں نے جواب دیا "جس کی بقا کی ذمے داری ہندستان و پاکستان کے علاوہ چین، روس اور افغانستان بھی لیں، جو کشمیر کے قریب ترین ہم سایہ ہیں۔"

"میں نے ارادتاً اس کا ذکر نہیں کیا تھا" شیخ صاحب نے جواب دیا "یہ ناممکن العمل ہے۔ اور اگر وجود میں آئے بھی تو کشمیر بین الاقوامی سیاست کا کمزور مہرہ بن جائے گا، جو کبھی اس کی گود میں ہو گا اور

کبھی اس کی:"

آزاد کشمیر کے بارے میں، اگست ۱۹۵۲ء تک ان کا یہی نظریہ تھا۔ اور اُن کے بیانات کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے، جس کے صحیح تسلیم نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہے، تو اگست ۱۹۵۳ء میں وزارت عظمیٰ سے برطرفی و گرفتاری کے وقت بھی کشمیر کو "ایشیا کا سوئزرلینڈ" بنانے کا وہ خواب نہیں دیکھ رہے تھے، اگرچہ بخشی غلام محمد اور ان کے حواریوں نے شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے وقت ہندستانی عوام کو، اور شاید ہندستانی حکومت کو بھی، بڑی پرکاری کے ساتھ اس کا یقین دلایا تھا کہ بیرونی طاقتوں سے سازباز کر کے شیخ عبداللہ آزاد و مختار کشمیر بنانے کے درپے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ امریکی ڈماکریٹک پارٹی کے لیڈر ایڈلائی اسٹونسن کے مشورے سے، جو مئی ۱۹۵۳ء میں برصغیر کے دورے پر آئے تھے اور کشمیر بھی گئے تھے، شیخ عبداللہ نے یہ اسکیم مرتب کی تھی۔ اس الزام پر گفتگو کرنے کی یہ جگہ نہیں ہے، آگے آنے والے صفحات میں اس پر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

"ہمارے یہاں کرپشن بھی ہے"

اس ملاقات کے لئے جتنا وقت مجھے دیا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ میں نے، یا خود شیخ عبداللہ نے لے لیا، اور باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس عرصے میں مدحت قدوائی، جو اس وقت کشمیر گورنمنٹ کے چیف سکریٹری تھے، تین بار ان کے کمرے میں آئے، لیکن انھیں شیخ صاحب نے واپس کر دیا۔ ہماری بات چیت کا آخری موضوع "کرپشن" تھا، جسے

خود شیخ صاحب ہی نے اپنے مسائل کے ضمن میں چھیڑ دیا تھا۔

"ہمارے یہاں کرپشن بھی ہے" شیخ صاحب نے فرمایا "جو روز بروز بڑھ رہا ہے، اور زیادہ تکلیف دہ یہ ہے کہ یہ نچلی سطح سے کہیں زیادہ بالائی سطح پر ہے"۔

"قبل اس کے کہ آپ اس موضوع پر روشنی ڈالیں" قطع کلام کی معافی مانگتے ہوئے میں نے کہا "ایک چھوٹا سا اپنا تجربہ بیان کر دوں، جو کل ہی مجھے ہوا ہے"۔

ایک جگہ مجھے تانگے سے جانا تھا۔ ان دنوں وہاں تک جانے کے لئے تانگے والے دو آنہ سواری لیتے تھے۔ ایک تانگے پر دو اسکولی بچے بیٹھے تھے، میں بھی اسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بعد دو سواریاں اور آگئیں، لیکن تانگہ والا چلا نہیں جب میں نے چلنے کا تقاضا کیا تو اس نے جواب دیا:

"ابھی سواری پوری نہیں ہوئی ہیں" اور بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان کے پیسے مجھے نہیں ملیں گے۔ یہ ڈپٹی منسٹر کے بچے ہیں"۔

یہ جواب سن کر میں سکتے میں آگیا۔ میرے جرح کرنے پر تانگے والے نے پہلے ایک ہندو ڈپٹی منسٹر کا نام لیا، جو اس طرف نہیں رہتے تھے، اور یہ بچے بھی مسلمان تھے۔ جب میں نے مزید جرح کی تو اس نے ایک مسلمان ڈپٹی منسٹر کا نام بتایا۔ تانگے والے کا نام اور نمبر میں نے نوٹ کر لیا۔

شام کو جب مجاہد منزل پہنچا، جہاں میں مولانا مسعودی کا مہمان تھا تو وہ ڈپٹی منسٹر صاحب بھی اتفاقاً وہاں موجود تھے۔ دیر تک ہم لوگ باتیں کرتے رہے، لیکن بار بار کوشش کرنے کے باوجود یہ قصہ بیان کرنے کی میں ہمت نہ کر سکا۔

جن کے متعلق شیخ عبداللہ نے جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنی پہلی رہائی کے فوراً بعد کہا تھا کہ:

"میرے ایسے بھی ساتھی تھے، جنھوں نے لاکھوں روپے بنائے ہیں.
میں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ان کی تحقیقات کی جائے۔[1]"

۱؎ ہفتہ وار "سچ" (جموں)، ۱۷/جنوری ۱۹۵۸ء

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

شیخ عبداللہ سے یہ قصہ بیان کرتے ہوئے میں نے نہ تو ڈپٹی منسٹر صاحب کا نام ہی لیا اور نہ یہ بتلایا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ وہ دیر تک نام پوچھتے اور جرح کرتے رہے۔ میرے انکار کے ساتھ ساتھ ان کا اصرار بھی بڑھتا رہا۔

بالآخر انھوں نے جز بز ہو کر کہا "آپ اس کمرے سے باہر جا نہیں سکتے ہیں جب تک کہ نام نہ بتائیں"، اور مجبوراً مجھے نام بتانا ہی پڑا۔ انھوں نے فوراً ڈپٹی منسٹر صاحب کو ٹیلیفون کیا، جو اس وقت اپنے کمرے میں تھے نہیں ان کے پرسنل اسسٹنٹ کو ہدایت کی کہ جیسے ہی وہ آئیں انھیں فوراً بھیج دیا جائے۔ اب میں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی اور شیخ صاحب سے اجازت لینی چاہی۔ لیکن میری بات کاٹتے ہوئے شیخ صاحب نے ایک مشترک دوست کا ذکر چھیڑ دیا اور اس سلسلے میں دس بارہ منٹ اور گزر گئے۔ جب میں چلنے لگا تو، ازراہ نوازش، شیخ صاحب باتیں کرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک رخصت کرنے آئے۔ ہم رخصتی مصافحہ کر ہی رہے تھے کہ سامنے سے ڈپٹی منسٹر صاحب نمودار ہوئے۔ انھیں دیکھتے ہی میرا سارا جسم سرد ہو گیا، اور اس وقت میری جو حالت ہوئی، وہ ناقابل بیان ہے۔ شیخ صاحب کے دفتر کے کمرے سے متصل ایک بڑا سا ہال تھا۔ ہم دونوں کو لے کر وہ اسی ہال میں چلے گئے۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے تھے، جو شیخ صاحب سے ملنے ہی آئے تھے اور جنھیں میری ہی وجہ سے انتظار کرنا پڑا تھا۔ شیخ صاحب نے ان سب کو باہر جانے کا حکم دیا اور ایک کونے میں لے جا کر یہ قصہ ڈپٹی منسٹر صاحب سے بیان کیا۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں" شیخ صاحب نے ان سے کہا "اگر کوئی دوسرا اخبار نویس ہوتا تو اس قصے کو کس طرح اچھالتا۔"

"کل شام ہی کو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی" ڈپٹی منسٹر صاحب نے جواب دیا "اگر کل یہ قصہ انھوں نے بیان کیا ہوتا تو ان کی تشفی کر دیتا، اور اس کی تحقیقات بھی کر لی ہوتی۔"

ڈپٹی منسٹر صاحب نے جو صفائی پیش کی، اس میں بھی خاصا وزن تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے بچے روزانہ تانگے سے اسکول جاتے اور آتے ہیں۔ بچوں کے ہاتھ میں پیسے دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے، اس لئے اپنے محلے کے تانگہ اسٹینڈ کے ٹھیکے دار کو کچھ رقم پیشگی دے دیتے ہیں تاکہ جس تانگے پر بچے جائیں اور جس پر واپس آئیں، انھیں دو دو آنے دے دئے جائیں۔ یہ بیان کم از کم میرے لئے تشفی بخش تھا، لیکن شیخ صاحب اس سے مطمئن نہ ہوئے ممکن ہے کہ اس بیان کو انھوں نے بھی غلط نہ سمجھا ہو، مگر اس کی تحقیقات انھوں نے ضروری سمجھی۔ چناں چہ ہم دونوں کو اپنے دفتر کے کمرے میں وہ پھر واپس لے گئے، اور مجھ سے تانگے والے کا نام اور تانگے کا نمبر پوچھنے کے بعد پولیس کے کسی افسر کو ٹیلیفون پر ہدایت کی کہ فلاں نمبر کے تانگے والے کو اور فلاں محلے کے تانگہ اسٹینڈ کے ٹھیکے دار کو لے کر پانچ بجے شام کو ان کی کوٹھی پر آئے۔ مجھے اور ڈپٹی منسٹر صاحب کو بھی شام کو چائے اپنے ساتھ پینے کی انھوں نے دعوت دی۔ اس دعوت کو، عام حالات میں، بڑی خوشی سے میں قبول کرتا، لیکن اس وقت کوئی بہانہ کر کے میں نے اپنی گلو خلاصی کی۔

مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ اس تحقیقات کا آخری نتیجہ کیا نکلا، لیکن اس قصے سے شیخ عبداللہ کے طریق کار پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے جب کرپشن کی بات شروع کی تھی، اور جو اس قصے کی وجہ سے پوری نہ ہو سکی تھی، اس وقت ان کے ذہن میں کیبنٹ کے ان کے کچھ ساتھی بھی یقیناً رہے ہوں گے۔

”مجھے [شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے] ان واقعات کا علم سنیچر [۸ اگست ۱۹۵۳ء] کی رات کے گیارہ بجے ہوا۔“

جواہر لال نہرو
(کارروائی لوک سبھا: ۱۰ اگست ۱۹۵۳)

”سری نگر میں جون جولائی کا مہینہ نسبتاً گرم ہوتا ہے“ شیخ عبداللہ کی وزارت عظمیٰ سے برطرفی و گرفتاری کی داستان شروع کرتے ہوئے پنڈت شیام لال کول[1] نے کہا ”ان مہینوں میں دن ہی کو نہیں رات کو بھی اکثر پنکھے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی سری نگر کے موسم کی خوش گواری اس طرح بیدار ہوتی ہے، جیسے کوئی نوخیز حسینہ آنکھ ملتے ہوئے بستر سے اٹھ رہی ہو۔ ۱۹۵۳ء کے اگست کا موسم بھی کچھ اسی قسم کا تھا، لیکن، خلاف معمول سری نگر کا سیاسی موسم اس وقت خاصا گرم تھا۔“

اوائل اگست ۱۹۵۳ء میں سری نگر کے سیاسی موسم کی، خلاف معمول، گرمی دراصل نتیجہ تھی شیخ عبداللہ کی اس انتہا پسندانہ اور بے لوچ روش کا، جو کشمیر کے باب میں ہندستان کے بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ رجحانات کا جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا جوابی حملہ تھا۔ چناں چہ خود شیخ عبداللہ کو، خود ان ہی کے الفاظ میں، اس بات کا ”احساس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، کیا ہونے والا

---

[1] شیام لال کول نیشنل کانفرنس کے پرانے کارکن ہیں، اور شیخ عبداللہ کے عہد میں ڈائرکٹر وزیٹرس بیورو تھے۔

ہے، یہ "وہ بھی" "نہ جانتے تھے۵"

"۹؍اگست ۱۹۵۳ء کو جو حادثہ پیش آیا، اسے تو بہرحال آج نہیں تو کل ہونا ہی تھا" شیام لال کول نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے لئے سری نگر اور دلّی میں زمین تیار کی جا چکی تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک معمولی سا واقعہ اس عظیم سانحے کا محرک بن گیا، جو پہلی یا دوسری اگست ۱۹۵۳ء کی صبح کو میری موجودگی میں پیش آیا تھا۔ وزیراعظم کے پرائیویٹ آفس میں اس تاریخ بھی حسبِ معمول ملنے والوں کا ہجوم تھا، جس میں ہر طبقے کے لوگ تھے۔ اس ہجوم میں ایک غریب کشمیری کنبہ بھی تھا، جو مضافات سری نگر کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، اور روتا پیٹتا یہ فریاد لے کر آیا تھا کہ ان کا اکلوتا بچہ کسی شدید مرض میں مبتلا ہے جسے دو دن سے وہ سرکاری اسپتال لے جا رہے ہیں لیکن اسے داخل نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ ان کا واویلا سن کر اور مریض کی حالت دیکھ کر شیخ صاحب پر جو اثر ہوا وہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ ان سب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر میں اسپتال لے گیا اور داخل کرایا، جو دوائیں وہاں موجود نہیں تھیں بازار سے منگا کر دیں، لیکن طبی امداد میں تاخیر کی وجہ سے اس کا مرض علاج کی حد سے گزر چکا تھا اور دوسرے دن بچے نے دم توڑ دیا۔

"شیخ صاحب نے اس قصے کی تحقیقات کا صراف سے مطالبہ کیا،

---

۵ ہفتہ وار 'محاذ' (شیر کشمیر نمبر)، ص ۱۲،

جو متعلقہ محکمے کے وزیر تھے۔ تحقیقات کے بعد انھوں نے جو رپورٹ پیش کی اس میں ڈاکٹروں کو بچانے کے لئے واقعے کی نوعیت کو کم کرنے کی انھوں نے کوشش کی۔ یہ بات شیخ صاحب کو ناگوار ہوئی۔ اس سے پہلے بھی ان کی نااہلی کی شکایتیں شیخ صاحب کے پاس آچکی تھیں، انھوں نے صراف سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا، جس نے تودۂ بارود میں چنگاری کا کام کیا۔"

شیام لال کول کے اس بیان کی تائید خود شیخ عبداللہ کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے، جو اپنی برطرفی سے صرف آٹھ دس گھنٹے پہلے انھوں نے مولوی مسعودی کو لکھا تھا، جو اس وقت دہلی میں تھے:

آخری کیبنٹ میٹنگ

"کل [۷ اگست کو] ہماری کیبنٹ میٹنگ ہوئی۔ صراف صاحب نے مجھے وہ رپورٹ دی جو کشمیر گورنمنٹ ہاسپٹل کے سپرنٹنڈنٹ نے میرے اس خط کے جواب میں بھیجی تھی، جس میں میں نے ان سے ان حالات کے متعلق دریافت کیا تھا، جن کی وجہ سے ایک سات سالہ بچے کی موت واقع ہوئی تھی۔ ہاسپٹل والوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن صراف صاحب نے ہاسپٹل والوں کی حمایت میں باتیں کرنا شروع کیں، اس افسوس ناک واقعے کی تفصیلات یہ ہیں:

"کچھ مدت ہوئی کہ ایک غریب مسلمان کا سات سالہ اکلوتہ لڑکا بیمار ہوا، اور وہ گورنمنٹ ہاسپٹل اسے دکھانے گیا۔ ڈاکٹر پارنے معائنے کے بعد اس کو مینن جائٹس کا مریض قرار دیتے ہوئے ہاسپٹل میں داخل کرنے کا

حکم دیا۔ ہاؤس سرجن ڈاکٹر زتشی نے لڑکے کو داخل کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ وارڈ میں جگہ نہیں تھی۔ دوسرے دن مریض کا باپ مریض کو لے کر ہاسپٹل گیا، لیکن اس دن بھی مریض کو داخل کرنے سے انکار کیا گیا.... یہ غریب انسان مایوس ہو کر میرے پرائیوٹ دفتر میں واویلا کرتا ہوا آیا... اس وقت میرے پرائیوٹ دفتر میں پنڈت شام لعل کول ڈائرکٹر وزیٹرس بیورو موجود تھے۔ اس نے اس غریب پر ترس کھا کر مریض کو کار میں بٹھایا اور نیشنل ہاسپٹل میں داخل کرایا، اور اپنی جیب سے کچھ روپیہ خرچ کر کے انجکشن اور دوسری دوائیاں بازار سے منگوا دیں نیشنل ہاسپٹل کے ڈاکٹر پشن نے مریض کو بچانے کے لئے کافی کوشش کی، لیکن وقت گزر چکا تھا اور یہ معصوم بچہ جاں بر نہ ہو سکا۔ ... سپرنٹنڈنٹ ہاسپٹل نے لکھا تھا کہ جب مریض کے مرض کی تشخیص ہوگئی تو اس کو میڈیکل سائڈ کی طرف بھیج دیا گیا، لیکن وہاں سے اسے سرجیکل سائڈ کی طرف ڈھکیل دیا گیا۔ لیکن کہیں بھی اسے جگہ نہ ملی اور ڈاکٹر آپس میں بحث و مباحثہ میں رہے کہ اس بچے کے ساتھ کیا سلوک ہو، اور اس بحث میں کافی دیر لگی۔ مریض اور اس کا باپ تھک کر ہاسپٹل سے چلے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ہمیں افسوس ہے کہ بحث بحث میں مریض اور اس کا باپ اور کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ بہرحال آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔ اس جواب کے سننے اور صراف صاحب کی ایسے جواب کی حمایت پر میں قدرتی طور پر کافی بے چین ہوا، اور میں نے صراف صاحب سے پوچھا کہ "یہ پہلا واقعہ نہیں، جس کی وجہ سے میں آپ سے مطمئن نہیں ہوں، بلکہ اور بھی ایک دو واقعات میری نوٹس میں آئے ہیں،

جس کا جواب میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔

"میں نے سنا ہے کہ کچھ مہینے پہلے جموں میں ہمدانی صاحب کے دفتر سے ایک گھڑی اٹھ گئی تھی، اور تحقیقات پر ثابت ہوا کہ یہ گھڑی آپ کے دفتر ہی کے ایک ملازم نے اٹھا کر آپ کے ڈرائیور کے حوالے کی تھی۔ تحقیقات پر یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ ملازم آپ کا ایک قریبی رشتہ دار ہے اور آپ کے ساتھ ہی کھاتا پیتا ہے۔ لیکن اس ملازم کو برطرف کرنے یا سخت سزا دینے کی بجائے، اس پر صرف تھوڑا بہت جرمانہ کیا گیا اور اسے سری نگر جیل میں تعینات کیا گیا۔ کیا یہ طریق کار درست ہے۔ صراف صاحب نے جواباً کہا کہ انھوں نے ہمدانی صاحب کو پورے اختیارات دئے تھے کہ وہ جو چاہیں اس ملازم کو سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمدانی صاحب نے کہا کہ ان کو صراف صاحب نے ٹیلی فون پر کہا کہ انھیں افسوس ہے کہ اس قسم کی چوری ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے کی ہے، اس لئے اب یہ ان کی عزت کا معاملہ ہے ... میں نے ان سے پوچھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک ملازم کے خلاف دن دھاڑے چوری کرنا ثابت ہے، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ملازم آپ کا قریبی رشتہ دار ہے، اس لئے میں کسی صورت میں بھی اس حرکت کو ایڈمنسٹریشن کے لئے درست نہیں سمجھتا ہوں کہ اس شخص کو آپ ملازمت میں رہنے دیتے۔ اگر آپ کے ماتحتوں نے کسی بھی وجہ سے مناسب سزا تجویز نہیں کی تھی، تو آپ کو اپنی، جماعت کی اور ایڈمنسٹریشن کی عزت کی خاطر اسے فوراً برخاست کرانا چاہئے تھا، اور پرائم منسٹر کی نوٹس میں یہ واقعہ لانا چاہئے تھا۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

"صراف صاحب نے غصہ میں آکر کہا کہ مجھے امپلائی (ملازم) کے مفاد کو بھی دیکھنا ضروری تھا۔

"تیسرا واقعہ [یہ ہے کہ] کچھ مدت ہوئی پہلگام نوٹی فایڈ ایریا کے اکزیکٹو ملازموں کے خلاف غبن اور دیگر سخت قسم کی شکایات پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک بکروال کی درخواست آگئی کہ اس کا ایک بھیڑو جو اس کے گلہ سے علاحدہ ہو گیا تھا، پہلگام کے اکزیکٹو افسر نے پلازا ہوٹل والوں کے ہاتھ تیس روپے میں بیچ دیا۔ میں نے یہ درخواست بھی صراف صاحب کے پاس بابت تحقیقات بھیجی۔ چناں چہ صراف صاحب نے ہمدانی صاحب کو جملہ شکایات کی تحقیقات کے لئے پہلگام جانے کو کہا۔ ہمدانی صاحب نے ان شکایات کی پوری تحقیقات کی اور یہ ثابت ہوا کہ واقعی پہلگام کے اکزیکٹو افسر نے یہ حرکت کی تھی۔ اور اس کے علاوہ بھی حسابات کے متعلق آڈٹ [audit:] نے جو شکایات کی تھیں وہ بھی ان کی نظر میں درست نکلیں۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں اکزیکٹو افسر کی برطرفی کی سفارش کی اور یہ بھی لکھا کہ جن افسروں نے واقعات کو چھپانے کی کوشش کی ہے، ان کے خلاف بھی پوری تحقیقات کی جائے۔ ہمدانی صاحب نے یہ رپورٹ ۱۷ جولائی ۱۹۵۳ء کو صراف صاحب کی خدمت میں پیش کی، لیکن آج تک صراف صاحب نے اس رپورٹ پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔

"میں نے صراف صاحب سے سوال کیا کہ انھوں نے اس معاملے میں آج تک کیوں خاموشی برتی؟ تو جواباً انھوں نے کہا کہ وہ اس تحقیقات سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تحقیقات کسی چھوٹے افسر

نے نہیں کی ہے، بلکہ ہمارے ایک ساتھی اور حکومت میں آپ ہی کے ڈپٹی منسٹر نے کی ہے۔ آپ کو کم از کم پہلگام کے اکزیکٹو افسر کو معطل کرنا چاہئے تھا اور کیبنٹ کی نوٹس میں لانا چاہئے تھا۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

"صراف صاحب نے کہا کہ بھیڑو کے معاملے کے متعلق چوں کہ ابھی پولیس تحقیقات کر رہی ہے، اس لئے میں نے افسر کو معطل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"ان افسوس ناک واقعات کو دیکھ کر اور صراف صاحب کے جوابات کو سن کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صراف صاحب کا طریق کار حکومت کے لئے باعث نیک نامی نہیں ہے۔ اس لئے میں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ مجھے اپنا استعفا دے دیں۔ ابھی تک ان کا استعفا میرے پاس نہیں پہنچا ہے[1]..."

یہ قصہ شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری سے کم و بیش ۴۸ گھنٹے پہلے، ۷ اگست کا ہے، اور یہی واقعہ ان کی برطرفی و گرفتاری کا ڈرامہ فوری طور پر اسٹیج کئے جانے کا محرک بن گیا۔ اپنی پہلی رہائی کے بعد ایک تقریر میں خود شیخ عبداللہ نے بھی اسی واقعے کو اصل سبب قرار دیتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا تھا،

"گرفتاری کے وارنٹ کے ساتھ صدر ریاست کا ایک خط بھی مجھے دیا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ کابینہ میں شدید اختلاف کے باعث ملکی نظم و نسق خراب ہو گیا ہے، اور صدر ریاست نے ان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی

---

[1] خط شیخ عبداللہ مورخہ ۸ اگست ۱۹۵۳ء۔ مملوکہ مولانا محمد سعید مسعودی

تھی۔ یہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ ۸ اگست تک کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ بہرکیف میری گرفتاری کے لئے جو بہانہ تراشا گیا وہ بھی سخت جھوٹ تھا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میری کابینہ کے ایک وزیر کے خلاف بہت دنوں سے بدعنوانیوں کی شکایت تھی۔ چناں چہ میں نے حقوق آئینی کا استعمال کرتے ہوئے ان سے استعفا طلب کیا تھا اور ۸ اگست ۱۹۵۳ء کو اسی سلسلے میں میں صدر ریاست سے ملا بھی تھا، اور یہ طے پایا تھا کہ ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء کو اکٹھے بیٹھ کر اس جھگڑے کو نپٹائیں گے لہ۔"

لیکن اس کا وقت آنے سے ۲۴ گھنٹے پہلے شیخ عبداللہ کو گرفتار کر کے کد بھیج دیا گیا۔ مولانا مسعودی کے نام شیخ عبداللہ کے جس خط کے طویل اقتباسات اوپر درج کئے گئے ہیں۔ اس کی آخری چند سطریں بھی اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والے واقعات کا شیخ عبداللہ کو تو احساس نہیں تھا لیکن مسعودی صاحب غالباً حالات کی رفتار سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ انھیں اطمینان دلاتے ہوئے شیخ عبداللہ نے لکھا تھا:

"آج میں دو دن کے لئے گلمرگ جا رہا ہوں۔ سوموار کو واپس آجاؤں گا۔ حالات بہت اچھے ہیں۔ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ لوگ انتشار پسندوں کی چالوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور ہندستانی اخبارات میں جو اطلاعات یہاں کے نامہ نگاروں کی شائع ہوتی ہیں ان میں کافی رنگ آمیزی ہوتی ہے، اور حقیقت سے دور وہ دراصل ان کے اپنے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ باقی سب

لہ محاذ (شیر کشمیر نمبر)

خیریت ہے، والسلام لہ۔"

برطرفی و نظربندی

"شیخ عبداللہ گلمرگ کسی سازش کے تحت نہیں گئے تھے" شیام لال کول نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا "اتوار کا دن وہاں گزارنے کے علاوہ ایک مقصد وہاں جانے کا یہ بھی تھا کہ گلمرگ کی سڑک کی توسیع کے سلسلے میں چند افسروں کی ایک میٹنگ بھی انھوں نے ۹ اگست کو وہیں بلائی تھی۔ مجھے بھی ڈائرکٹر دزیٹرس بیورو کی حیثیت سے اس میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ میں ۸ اگست ہی کو شیخ صاحب کے ساتھ چلا گیا تھا۔ دوسرے دن چیف انجنیر اور چیف سکریٹری بھی اسی سلسلے میں وہاں آنے والے تھے۔

"ہم سب گلمرگ کے رسٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد شیخ صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اسکے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد، کسی دوست سے ملنے کے لئے میں نیڈوز ہوٹل جانے کی نیت سے باہر نکلا۔ اپنے ڈرائیور کو میں نے ہدایت کی تھی کہ میری جیپ کو رسٹ ہاؤس کے احاطے ہی میں رکھے اور کنجی اسی میں لگی رہنے دے۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ ڈرائیور کنجی چھوڑنا بھول گیا ہے۔ اس کی تلاش میں نوکروں کے کوارٹرس کی طرف گیا تو وہ سب خالی پڑے تھے۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آیا جب میں کچھ اور آگے

لہ مکتوب بنام مولانا مسعودی: تذکرہ

بڑھا، اور مجھے اندازہ ہوا کہ پولیس نے رسٹ ہاؤس کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ واپس آکر یہ قصہ میں نے آر، سی [رینا] کو سنایا جو شیخ صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔"

اس صورت حال کی تفتیش اور اس کے متیقین کرنے میں خاصی رات گزر گئی۔ اس داستان کا اگلا حصہ خود شیخ عبداللہ کی زبانی یہ ہے:

"رات کے شاید ڈھائی تین بجے کا وقت ہوگا کہ دروازے پر دستک سے میں بیدار ہوا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو میرا پرائیویٹ سکریٹری آر، سی، رینا تھا۔ اس نے بتایا کہ رسٹ ہاؤس کو پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس افسر آیا اور اس نے کہا کہ 'میں گرفتاری کے لئے آیا ہوں وارنٹ گرفتاری طلب کرنے پر اس نے دکھایا تو میں نے کہا کہ یہ تو ڈی، آئی، جی [ڈپٹی انسپکٹر جنرل] کا جاری کردہ ہے اور اسے مجھے گرفتار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ بعد ازاں صدر ریاست کا اے، ڈی، سی بھی کاغذات لے کر آگیا۔ اس نے ایک لفافہ دیا، جس میں ایک خط میں تین کیبنٹ منسٹروں ـــــ بخشی غلام محمد، گردھاری لال ڈوگرا اور شام لعل صراف کی جانب سے عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا[58]۔ ایک [دوسرے کاغذ]

---

[58] شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے بعد کہا گیا تھا کہ متذکرہ بالا تین ممبروں نے عدم اعتماد کا "میمورنڈم" شیخ عبداللہ کو ۷ راگست کو دیا تھا، جو یقیناً صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ۸ راگست کے خط میں جو مسعودی صاحب کو شیخ عبداللہ نے لکھا تھا، اس کا ذکر ضرور کرتے۔

میں صدر ریاست کی جانب سے ڈِس مِسَل آرڈر [برطرفی کا حکم] تھا حالاں کہ وہ بھی غلط تھا۔ ایک [تیسرے کاغذ] میں گرفتاری کا حکم تھا۔ یہ دیکھنے کے بعد میں نے کہا کہ اچھا میں تیار ہو جاؤں۔ چناں چہ میں اندر آیا، وضو کیا، نوافل پڑھیں، پھر فجر کی نماز پڑھی اور ناشتہ وغیرہ میں مصروف ہو گیا۔ اور [آل انڈیا] ریڈیو [کی خبروں] کا انتظار کرتا رہا۔ جب ریڈیو پر بخشی غلام محمد کے وزیر اعظم بنائے جانے کی خبر سنی تو سارا کھیل سمجھ میں آگیا۔ تب مجھے ضرور شاک [صدمہ] ہوا کیوں کہ انھوں نے بڑی شدت سے اپنی لائلٹی [وفاداری] کا یقین دلایا تھا[59]۔"

نئے وزیر اعظم بخشی غُلام محمدؐ کا دَور

بالآخر ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کو وزارت عظمیٰ سے برطرف اور نظر بند کئے جانے کے بعد بخشی غلام محمد وزارت عظمیٰ کی مسند پر متمکن ہوئے، جو اس وقت تک کشمیر کے نائب وزیر اعظم ہونے کے علاوہ ہماری جانی پہچانی شخصیت اور نیشنل کانفرنس کے آزمودہ کار لیڈر بھی تھے۔ شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کی شخصی وفاداری بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ جو بھی کشمیر جاتا ان کی فراست و کارکردگی کا معترف ہو کر واپس لوٹتا۔ وزارت عظمیٰ کا قلم دان سنبھالنے کے بعد شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے جو اسباب انھوں نے بیان کئے وہ قوی ہونے کے علاوہ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکلے تھے، جو کل تک شیخ عبداللہ کو اپنا رہنما ہی نہیں تسلیم کرتا تھا، بلکہ انھیں اپنے ایمان کا چھٹا رکن بھی سمجھتا

---

[59] ماخذ ـ "شیر کشمیر نمبر": ص ۱۲۰

تھا۔ یہ ان ہی حالات کا نتیجہ تھا کہ بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ پر جو الزامات عاید کئے، اس وقت۔ ان کی صداقت کشمیر کی برف پوش بلند و بالا چوٹیوں کی طرح صاف و شفاف معلوم ہوئی، اور ایسا لگتا تھا کہ صدر ریاست جموں و کشمیر نے شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کا بروقت قدم اٹھا کر صرف ریاست جموں و کشمیر ہی کو نہیں بلکہ پورے برصغیر ——— ہندستان و پاکستان کو تیسری عالم گیر جنگ کا مرکز و محور بننے کے عظیم خطرے سے بچا لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کی برطرفی گرفتاری کشمیر ہی کی نہیں بلکہ ہندستان کی جدید تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔

بنیادی الزام

وزارت عظمیٰ سے برطرفی و گرفتاری کے بعد شیخ عبداللہ پر جو الزامات لگائے گئے، ان کی فہرست تو مختصر تھی مگر ان کی نوعیت بھیانک اور سنگین تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الزام ایک ہی تھا، جسے مختلف زبانیں اپنے اپنے انداز سے پیش کرتی تھیں، اسی وجہ سے اس کی شکل کئی الزام کی سی ہو جاتی تھی۔ جس روز شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کا المیہ گلمرگ کے مرغزار میں اسٹیج کیا گیا، اسی دن شام کو سری نگر کے ریڈیو اسٹیشن نے بخشی غلام محمد کی ایک تقریر نشر کی، جو اب ریاست کے نئے وزیر اعظم تھے۔ اس تقریر میں بخشی صاحب نے شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے جواز میں جو الزام ان پر لگایا تھا، وہ یہ ہے:

"... ہمارے بعض سابق رفقا کی سرگرمیوں اور ان کی تقریروں سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ریاست کے بچے کھچے ملبے سے وہ ایک آزاد ریاست کی تشکیل کی سوچ رہے تھے۔ ان کے اس اقدام کو، قدرتی طور پر، اس ریاست سے دل چسپی رکھنے والی بعض اُن بیرونی طاقتوں کی

چشم پوشی و حمایت بھی حاصل تھی، جو اب تک ریاستی عوام کی آزادی و حق خود اختیاری کی راہ میں حایل رہی تھیں۔ [ریاست کی داخلی] ان قوتوں اور ان کے بیرونی حمایتیوں کے منصوبوں کو اگر بروقت خاک میں نہ ملایا گیا ہوتا، تو یہ صورت حال ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے مستقبل کے لئے بڑے آتش گیر امکانات پیدا کر دیتی۔

... آزادی کا نعرہ بڑا گمراہ کن ہے۔ ایشیا اور دنیا کے دوسرے حصوں کے داخلی حالات کے پیش نظر اس تصور کے پیش کرنے والوں کے مقاصد کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ آزاد کشمیر، سامراجی طاقتوں کے زیر سایہ ہندستان و پاکستان کے عوام کی آزادی کے لئے ایک شدید خطرہ ہوگا... [کشمیر سے] دل چسپی رکھنے والی طاقتوں کی جنگی آویزش یہاں بھی ایک دوسرا کوریا کھڑا کر سکتی ہے[1]..."

"شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کا جہاں تک تعلق ہے اُسے" بقول سسر گپتا "ہندستان کے انتہا پسند داہنے اور انتہا پسند بائیں بازوؤں [جن سنگھ اور کمیونسٹ] دونوں کی حمایت حاصل تھی[2]" لیکن مندرجہ بالا فرد جرم میں "غیر ملکی طاقتوں" کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کی تعبیر کے سلسلے میں ان دونوں بازوؤں میں اختلاف تھا۔ آزاد کشمیر کے منصوبے میں جن سنگھ کو سوویٹ یونین کی ریشہ دوانی محسوس ہوتی تھی اور کمیونسٹوں کو اس میں امریکا کا

---

[1] Sisir Gupta : *Kashmir* — ص ۲۶۶

[2] ایضاً ص ۲۶۷

ہاتھ نظر آتا تھا۔ جن سنگھ کا دعویٰ بے دلیل تھا، اور اس کا وزن یوں بھی کم ہو جاتا تھا کہ شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے معاملے میں بخشی صاحب کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی اس درجہ حمایت حاصل رہی[1] کہ اس کا فیصلہ کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے المیہ کا منصف بخشی صاحب کا گروپ تھا یا ہمارے کمیونسٹ دوست تھے۔ بہرکیف اس کا حق تصنیف بخشی صاحب کے گروپ کے نام بھی اگر محفوظ کر دیا جائے تو اس سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ کمیونسٹوں کی حیثیت اس ڈرامے کے منیجر کی تھی، جنھیں بعد میں کمیشن کی رقم بھی نہیں مل سکی تھی۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ کشمیر اور شیخ عبداللہ کے بارے میں بھی ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی سمجھ اسی درجہ ناقص نکلی، جس درجہ پاکستان کے سلسلے میں غلط ثابت ہو چکی تھی، جس کی تائید انھوں نے صرف اس خوش فہمی کی بنا پر کی تھی مسلمانوں کی اکثریت چوں کہ پرولتاری ہے، جو کمیونزم کے اصولوں کو بہ آسانی قبول کر لے گی، اور اسی مفروضہ کے پیش نظر پاکستان میں کمیونسٹ انقلاب کے قوی امکانات انھیں نظر آئے تھے۔ کشمیر کے باب میں بھی شاید

---

[1] شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے وقت کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ایک ممتاز ممبر اور چند دوسری صف کے کمیونسٹ بھی سری نگر میں موجود تھے اور انھوں نے اس سلسلے میں عملی حصہ بھی لیا تھا۔ بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے جواز میں ایک طویل بیان بھی شایع کیا (دیکھیے کمیونسٹ پارٹی کا انگریزی ترجمان "کراس روڈ"، مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۵۳ء)۔ نیز کمیونسٹ پارٹی نے اسی سلسلے میں کئی کتابچے بھی مختلف زبانوں میں شایع کیے۔

ان کا اسی قسم کا نظریہ تھا۔ شیخ عبداللہ جس نے "نیا کشمیر" کے سوشلسٹ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی تھی اور جسے کل تک کمیونسٹ پارٹی کی حمایت حاصل رہی تھی، اسے یکایک انھوں نے بورژوا طبقے کا نمائندہ اور امریکی سامراج کا اجنٹ قرار دیا، اور شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے میں بخشی غلام محمد کو، جن کا بنیادی طور پر پرولتاری طبقے ہی سے تعلق تھا، کمیونسٹ اپنے گنو کا سمجھ بیٹھے۔ انھیں شاید یہ غلط فہمی بھی تھی کہ بخشی غلام محمد ان کی مٹھی میں رہیں گے، اور ۹ اگست کے "انقلاب" کے ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک یہی رہا بھی، لیکن جلد ہی صورت حال بدل گئی اور بالآخر پاکستان کی طرح کشمیر سے بھی کمیونسٹ پارٹی کو مایوس ہونا پڑا۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی کی تحقیقاتی رپورٹ

شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے دو ماہ بعد پرجا سوشلسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے اس قصے کی تحقیقات کے لئے ایک وفد سری نگر بھیجا، جو صادق علی[1] اور مادھو لمائی پر مشتمل تھا۔ کسی ہندستانی سیاسی پارٹی کا شاید یہ پہلا، اور غالباً آخری بھی، وفد تھا جو اس سلسلے میں کشمیر گیا تھا۔

پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اس وفد نے سب سے پہلے ریاست کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد سے ملاقات کی، جنھوں نے اس واقعے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے "امریکیوں سے شیخ عبداللہ کے روز افزوں تعلقات" پر خصوصیت سے زور دیا ــــ شاید اسی بنا پر وفد کے ممبروں

---

[1] حال جنرل سکریٹری آل انڈیا کانگریس کمیٹی

نے ــــ

" برسر اقتدار پارٹی [نیشنل کانفرنس] اور حکومت دونوں کے سرکردہ نمائندوں سے سوال کیا کہ ان کے پاس اس کا کوئی دستاویزی ثبوت ہے کہ امریکا سے ساز باز کر کے شیخ عبداللہ آزاد وادیٔ کشمیر کے قیام کے درپے تھے؟ یہ سوال ہم نے صرف اس بنا پر کیا تھا کہ اخباروں میں جو بیانات شایع ہوئے تھے، ان میں اس امر کے دستاویزی ثبوت کے وجود کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ لیکن سب نے اس سے انکار کیا کہ ان کے پاس اس کا کوئی دستاویزی ثبوت بھی ہے[1]"

"یہ الزام ... میرے ساتھ شدید ناانصافی ہے"

گرفتاری کے تین سال بعد اکتوبر ۱۹۵۶ء میں کشمیر دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے سلسلے میں شیخ عبداللہ نے خواجہ غلام محمد صادق کو، جو دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے، ایک خط لکھا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے صادق صاحب نے شیخ عبداللہ کو یاد دلایا تھا کہ:

" [مارچ تا اگست ۱۹۵۳ء کے] اس دور میں آپ ایک ٹوٹی پھوٹی آزاد ریاست کے قیام کے لئے، جو کم و بیش وادیٔ کشمیر ہی پر مشتمل ہوتی، علانیہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے، اور ہمارے پُرخلوص التماس کے باوجود اس تصور سے

---

[1] Report on Kashmir — : مرتبہ صادق علی و مادھو لمائی: ص ۴

آپ چمٹے رہے...[1]"

اس کی تردید کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے صادق صاحب کو لکھا:

"آپ نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں اس دور میں ایک ٹوٹی پھوٹی آزاد ریاست کے قیام کے لئے، جو کم و بیش وادیٔ کشمیر پر مشتمل ہوتی علانیہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہا تھا۔ میں اس سلسلے میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام لگا کر آپ نے میرے ساتھ شدید ناانصافی کی ہے...[2]"

صادق صاحب نے اس خط کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبداللہ کی کابینہ میں اختلافات پیدا ہو جانے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عبداللہ نے لکھا:

" میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سے زیادہ حقیقت سے دور کوئی اور بات نہیں ہو سکتی... ہاں اختلاف یقیناً پیدا ہوا، لیکن اس وقت جب کہ بدانتظامی کے سنگین الزامات کی بنا پر شام لال صراف سے میں نے استعفا مانگا۔ کابینہ کے کچھ ممبروں نے، جنھیں خود اپنی خرابیوں کا بھی احساس تھا، اسی شدید اقدام کو ناپسند کیا[3]"

شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری سے دو تین ہفتہ قبل ان کے خلاف پروپگنڈے کی ایک مہم ملک گیر پیمانے پر شروع کی گئی تھی۔ ہندو فرقہ پرست

---

[1] Sadiq-Abdullah Correspondence ص ۱۰
[2] ایضاً ص ۱۹
[3] ایضاً ص ۲۰

پارٹیاں —— ہندو مہاسبھا، جن سنگھ اور رام راجیا پریشد تو شیخ عبداللہ کے خلاف علانیہ مہم چلا رہی تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی بھی، اپنے مخصوص انداز میں، یہی کام کر رہی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں کانگرس کے کچھ لوگ بھی شیخ عبداللہ کے خلاف کانا پھوسی کی مہم میں لگے تھے۔ چناں چہ پورے ملک میں عموماً اور دہلی میں خصوصاً شیخ عبداللہ کے بارے میں جو باتیں بڑے وثوق کے ساتھ کہی جاتی تھیں، ان ہی میں ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے بعض مرکزی وزیروں سے، جو ملک کے مقتدر لیڈر بھی تھے، سری نگر میں ملنے سے انکار کر دیا، یا یہ کہ جو لوگ شیخ عبداللہ سے ملتے ہیں ان کے سامنے وہ ہندستانی لیڈروں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ مولانا سعید مسعودی نے بھی یہ باتیں سنیں، جو اس زمانے میں ہماری پارلیمنٹ کے ممبر اور دہلی میں مقیم تھے۔ انھوں نے شیخ عبداللہ کو خط لکھ کر ان باتوں کی تصدیق چاہی۔ اس کے جواب میں شیخ عبداللہ نے گرفتاری سے دس بارہ گھنٹے قبل مولوی مسعودی کو لکھا:

"آپ کا خط مورخہ ۴ر اگست ملا۔ حالات مندرجہ سے آگاہی پائی۔
میں نے کسی سے آج تک ملنے سے انکار نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہندستان
سے جو بھی دوست آئے، ان سے میں نے گھنٹوں کشمیر کے معاملات
پر تبادلۂ خیال کرنے میں خوشی محسوس کی ہے[۱]۔"

"شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے ڈیڑھ دو ہفتے قبل ایک صاحب دہلی سے سری نگر آئے تھے" ایک واقف حال کشمیری نے مجھے بتایا:

---

[۱] خط مورخہ ۸ر اگست ۱۹۵۳ء: ملوکہ مولانا محمد سعید مسعودی۔ اس خط کا انگریزی ترجمہ بھی Sadiq-Abdullah Correspondence میں ضمیمے کے طور پر شایع ہو چکا ہے۔

"یہ صاحب ریاستی سطح کے لیڈر اور مرکزی وزیر بھی تھے۔ قدوائی صاحب نے شاید حالات کا جائزہ لینے کے لئے انھیں بھیجا تھا۔ بعض لوگوں نے ان کے ساتھ بڑا فیاضانہ سلوک کیا۔ تحایف سے لدے پھندے جب وہ لوٹے تو انھوں نے دہلی میں خاصی غلط فہمیاں پیدا کیں۔"

یہ بیان قرین صحت ہے۔ مسعودی صاحب نے متذکرہ بالا خط میں شاید اس کا بھی ذکر کیا تھا، اور اس کے جواب میں شیخ عبداللہ نے لکھا تھا:

"یہ غلط ہے کہ میں نے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے متعلق ان
ملاقاتوں میں تلخ گفتاری سے کام لیا۔ البتہ اتنا میں نے ضرور کہا کہ
جن سنگھ اور پرجا پریشد کے مقاصد کا جہاں تک تعلق ہے،
ان کی مخالفت کسی حلقے میں نہیں ہوئی، البتہ صرف ان کے طریق کار
سے اختلاف ظاہر کیا گیا ہے[۱]۔"

شیخ عبداللہ کی گرفتاری ناگزیر بن چکی تھی؟

شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے وقت ان کی ذہنی "قلابازی" کو اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور اسے اتنے قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے مسایل کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا تھا کہ یہ سوال کسی کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوا کہ شیخ عبداللہ کی گرفتاری واقعی ناگزیر ہو چکی تھی یا نہیں؟ یا شیخ عبداللہ کو قایل کر کے ان کے پرانے موقف پر انھیں واپس لیا جا سکتا تھا یا نہیں؟ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے تیرہ سال بعد سری نگر کے ایک ہفتہ وار اخبار نے

---

[۱] متذکرہ مکتوب مورخہ ۸ر اگست ۱۹۵۳ء

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

"کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کی راہ میں میری دشواری، اور شدید دشواری یہ رہی ہے کہ اس طرح کی تقریریں کی جاتی ہیں، جیسی کہ آنرایبل ممبر [ڈاکٹر شیاپرشاد مکرجی] نے کی ہے"

جواہر لال نہرو

(تقریر لوک سبھا: ۲۶ جون ۱۹۵۲ء

ریاست کشمیر کے سابق وحال وزیر اعلا ــــ بخشی غلام محمد صاحب اور خواجہ غلام محمد صادق صاحب سے تحریری سوال کیا:

"کیا ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی گرفتاری اس قدر ناگزیر بن چکی تھی کہ اس کو کسی طور پر ٹالا نہیں جا سکتا تھا؟"

بخشی صاحب کا جواب

بخشی صاحب نے اس سوال کا دو اور دو چار کی طرح جواب نہیں دیا ہے، اور یہ شاید ممکن بھی نہیں تھا۔ انھوں نے فلسفیانہ انداز میں اس واقعے کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے:

"۱۹۵۳ء کے واقعات کا تعلق کشمیر کی حالیہ تاریخ سے ہے۔ اس کے متعلق اختلاف رائے رہا ہے اور رہے گا کہ یہ واقعات ناگزیر تھے یا نہیں؟ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ کوئی چیز قطعی طور پر ناگزیر نہیں ہوتی لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ مخصوص حالات میں بعض چیزیں اس درجہ ناگزیر بن جاتی ہیں کہ ان سے فرار ممکن نہیں ہوتا، چاہے یہ کتنی ہی ناگوار اور تکلیف دہ کیوں نہ ہوں، اور ان کے متعلق فیصلہ کرنے والے کتنے ہی محتاط اور دور اندیش کیوں نہ ہوں۔ بہر کیف شیخ صاحب کو نظر بند کرنے کا فیصلہ ایک اہم فیصلہ تھا، جو مرکزی قیادت[1] اور

---

[1] مرکزی قیادت کا جہاں تک تعلق ہے، کانگرس کی تنظیم اور حکومت دونوں میں سب سے اہم ذات جواہر لال نہرو کی تھی، لیکن شیخ عبداللہ کو برطرف اور گرفتار کرنے کے فیصلے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے دوسرے دن لوک سبھا میں

ریاستی لیڈروں کی اکثریت [کا فیصلہ تھا] جس میں میرے علاوہ مسٹر صادق، مسٹر صراف، مسٹر ڈوگرہ اور دوسرے لیڈر بھی شامل تھے[1]۔"

صادق صاحب کی توجیہ

یہی سوال صادق صاحب سے بھی کیا گیا تھا، جنھیں بھی بخشی صاحب نے، مندرجہ بالا اقتباس میں، شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے فیصلے میں شریک ہونے والوں میں گنایا ہے۔ وہ اس وقت کشمیر گورنمنٹ میں نہیں تھے بلکہ کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کے پریسیڈنٹ تھے، لیکن نیشنل کانفرنس کی ہائی کمان کے ایک ممتاز ممبر ضرور تھے۔ بہر کیف صادق صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنا دامن بچانے کی کوشش نہیں کی ہے[2]۔ ان کا انداز بیان نظریاتی ہے۔ کم و بیش اسی طرح کی بات انھوں نے شیخ عبداللہ کو بھی لکھی تھی ان کا جواب یہ تھا:

"جولائی و اگست [۱۹۵۳ء] کے مہینوں میں شیخ صاحب کے کچھ ساتھیوں نے ایسے طریقے اپنائے، جن کا اگر بر وقت تدارک نہ کیا

بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"ان واقعات کی اطلاع مجھے سنیچر [۸ اگست] کی رات کے گیارہ بجے ملی... مزید اطلاعات اتوار کی صبح کو موصول ہوئیں..."

(کارروائی لوک سبھا: جلد ۴ حصہ دوم، کالم ۴۴۴۴)

[1] ہفتہ وار "آئینہ" (سری نگر) سالنامہ ص ۱۱ ـ ۲ دیکھیے اگلے صفحے کا حاشیہ۔

جاتا تو ریاست میں افراتفری اور بےچینی پیدا ہوجاتی ہم نے شیخ صاحب سے اپیل کرنے کی کوشش کی تاکہ افراتفری پیدا کرنے والی کارروائیوں کو ختم کیا جاسکے، لیکن بات کافی بڑھ چکی تھی۔ شیخ صاحب نے اپنے رفیقوں اور کارکنوں کی بات سننے کے بجائے ساری تنظیم اور حکومت پر ایک چھوٹے سے گروہ کے نظریات و خیالات مسلط کرنے کی کوشش کی۔ اسی بنیاد پر تنظیم اور حکومت میں اکثریت نے اپنی راہ الگ کرنے کا فیصلہ کرلیا[1]۔"

مولانا مسعودی کا نظریہ

صادق علی اور مادھولمائی نے، جو پرجا سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کی تحقیقات کے سلسلے میں گئے تھے مولانا مسعودی سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

"مسٹر مسعودی کی یہ رائے بھی اس جگہ درج کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ [۹ اگست کے واقعے سے پہلے] شیخ عبداللہ کی مزاجی کیفیت عدم مصالحت پسندانہ نہیں تھی، نیز یہ کہ [نیشنل کانفرنس کی] ورکنگ کمیٹی کا جلسہ وہ طلب کرچکے تھے، اور اس جلسے میں تمام

شیخ عبداللہ نے اپنی گرفتاری کے تین سال بعد ایک خط میں صادق صاحب کو شکایتاً لکھا تھا کہ انھوں نے بھی "گزشتہ تین برسوں سے اپنے طرزِ عمل سے" ان لوگوں کا ہم نوا بنالیا ہے، جو "۹ اگست کا انقلاب بروئے کار لائے تھے۔" — (شیخ صادق خط و کتابت، ص ۲۰)۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ اپنی گرفتاری کے فیصلے کا ذمہ دار جن لوگوں کو سمجھتے تھے، ان میں صادق صاحب شامل نہیں تھے

[1] ہفتہ وار "آئینہ" متذکرہ ص ۷

اختلافات پر بےلاگی سے بھرپور بحث ہونے والی تھی۔ ان حالات میں ۹ اگست کا عاجلانہ اقدام غیرضروری تھا[1]۔"

اگست ۱۹۵۳ء کی پوری صورتِ حال کو اگر سامنے رکھا جائے، جو اب جستہ جستہ آرہی ہے، تو مولانا مسعودی کے اس خیال میں یقیناً وزن ہے کہ "شیخ عبداللہ کی مزاجی کیفیت عدمِ مصالحت پسندانہ نہیں تھی" اور یہ کہ "۹ اگست کا عاجلانہ اقدام غیرضروری تھا۔" یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کا خیال تھا جو، ۹ اگست ۱۹۵۳ء سے قبل، شیخ عبداللہ کا ہم نوا نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ نیشنل کانفرنس کے اندرونی حلقے میں مولانا مسعودی شیخ عبداللہ کے مقابلے میں بخشی صاحب سے قریب تر تھے۔ لیکن بخشی صاحب کو اس کا بھی علم تھا کہ شیخ عبداللہ کو برطرف اور گرفتار کرنے کے اقدام سے مسعودی صاحب متفق نہ ہوں گے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس سلسلے میں ان سے مشورہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، اگرچہ وہ نیشنل کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے۔ صادق علی اور مادھولمائی نے جب بخشی صاحب سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے یہ عذرِ لنگ پیش کیا کہ ان سے "مشورہ کرنے کا وقت نہیں تھا[2]۔"

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

"آپ جو بھی کہئے" کشمیر کانگرس کے ایک سرکردہ لیڈر نے شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری کے بارے میں میرے خیالات سے جزوی اختلاف

---

[1] رپورٹ صادق علی و مادھولمائی: متذکرہ ص ۱۶

[2] ایضاً ایضاً

کرتے ہوئے کہا" یہ بھی حقیقت ہے کہ اس وقت نجی گفتگو ہی میں نہیں بلکہ عام جلسوں میں بھی شیخ عبداللہ جو شعلہ بار تقریریں کرتے تھے وہ ریاست کے وزیر اعظم کے شایان نہیں تھیں، اور ان سے ریاست کے استحکام کو یقیناً نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔"

"میں نے بھی ان کی وہ تقریریں پڑھی ہیں" میں نے جواب دیا" اپنی تمام شعلہ باریوں کے باوجود ان کی ان تقریروں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے یک سر کٹ کر الگ ہو جانا چاہتے تھے، اور یہ..."

"آپ نے تو وہ تقریریں پڑھی ہیں" انھوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے تو اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ لیکن آپ کا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ شیخ عبداللہ کو اس وقت واپس لایا جا سکتا تھا، جس کی، شاید ارادی طور پر، کوئی کوشش نہیں کی جا سکی۔ شیخ صاحب کی اس وقت بھی میں عزت کرتا تھا، اور آج بھی میرے دل میں ان کا احترام ہے، لیکن اس وقت بھی مجھے اس کا یقین تھا، اور آج بھی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر اور ہندستان کے باہمی رشتے کے بارے میں ۱۹۵۲ء تک ان کا جو نظریہ تھا ۱۹۵۳ء میں اس میں تبدیلی آ چکی تھی۔"

ہماری گفتگو اسی منزل تک پہنچی تھی کہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے اور اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دوسرے دن ہمیں پھر ملنا تھا، لیکن بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا۔

دھری چال

کانگرسی دوست کی مندرجہ بالا گفتگو میں نے ایک کشمیری پنڈت سے بیان کی جو اپنے کو "عبدالائی" کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس نے بھی دبے لفظوں میں اس کا اعتراف کیا کہ:

"شیخ صاحب یقیناً جذباتی واقع ہوئے ہیں" اس نے شیخ عبداللہ کی وکالت کرتے ہوئے کہا" عام جلسوں میں ان کا انداز بیان اکثر جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتا تھا۔ شیخ صاحب کے مخالفین دراصل دھری چال چل رہے تھے۔ یہ لوگ جب شیخ صاحب سے ملتے تو ان کے سامنے ملک میں بڑھتی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کا رونا روتے، واقعات کو توڑ مروڑ کر اور حالات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ یہی لوگ جب دلی جاتے تو شیخ عبداللہ کی ذہنی و فکری بے اعتدالیوں کی اور ان کے خیالات کی تبدیلی کی من گڑھت داستانیں جواہر لال نہرو کو سنا کر انھیں شیخ عبداللہ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے کشمیر میں کم ہی لوگوں نے جواہر لال نہرو کو اتنے قریب سے دیکھا ہوگا جتنا مجھے اس کا موقع ملا ہے۔ شیخ صاحب کے زمانے میں پنڈت نہرو جب کبھی کشمیر آئے تو ان کی دیکھ ریکھ اور ان کی خاطر تواضع میرے ہی ذمے رہی۔ جتنے انسانی اوصاف کے وہ حامل تھے، کم ہی کسی ایک آدمی میں جمع ہوتے ہیں۔ لیکن ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری بھی ہوتی ہے، جو اس کی بشریت کی ضامن ہوتی ہے۔ جواہر لال بھی انسان ہی تھے، ان کی بشری کمزوری یہ تھی کہ وہ کان کے کچھ کچے تھے، اور آخری

عمر میں گرد و پیش کے ماحول نے انھیں کچھ خوشامد پسند بھی بنا دیا تھا۔ اسی سے شیخ کے مخالفین کا داؤں ان پر چل گیا، اور جواہر لال نہرو ان سے کچھ کھنچ گئے ــــــ"

"کیا شیخ کو اپنے مخالفین کی چالوں کا علم نہیں تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"مخالفین کی چالوں کا علم تو ان کو بھی تھا" مخاطب نے جواب دیا "لیکن وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کو اقتدار سے محروم کرنے کے لئے ان کے حریف اس حد تک بھی جا سکتے ہیں۔"

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو؟

"شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو کے جو دیرینہ تعلقات تھے" کشمیری پنڈت سے میں نے مزید سوال کیا "ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ جواہر لال نہرو جب ان سے کھنچنے لگے تھے تو شیخ عبداللہ کو ان سے منہ در منہ باتیں کر کے اس معاملے کو ختم کر دینا چاہیے تھا"

"میں نے ابھی کہا تھا کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے" میرے کشمیری دوست نے جواب دیا، پھر فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے کہا "جواہر لال کی طرح شیخ صاحب بھی انسان ہی ہیں، جن کی انسانی کمزوری ان کی اَنا ہے۔ قومی لیڈر کی حیثیت سے کشمیر ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں، انھیں جو کامیابی نصیب ہوئی اس کی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ان کی اس خوش نصیبی

نے ان کی خودی کو مضبوط تر کر دیا۔ انھیں واقعی وہی کرنا چاہیے تھا جو آپ نے کہا ہے، لیکن ان کی خودی ہی نے شاید ان کا دامن تھام لیا، بلکہ یوں کہیے کہ ان کی زبان روک دی۔ بہرحال غالب نے شاید ان ہی دونوں کے لئے کہا تھا:

"وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو"

"آپ سمجھتے ہیں کہ ان ساڑھے چار برسوں میں [میری قید کے دوران] ہند سے کشمیر کا رشتہ مضبوط ہوا ہے؟ اگر ہندستان کو پانچ فی صدی بھی اپنا اعتماد بڑھانے میں یا شری نہرو کے دیش [کشمیر] کے چالیس لاکھ لوگوں کا بھلا ہوا ہو، تو بلا شبہ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے، مجھے اس کا قطعاً گلہ نہ ہوگا۔ دوستوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا میں نے نہیں سیکھا ہے، اور نہ دوستوں کے خلاف کبھی سازش و غداری کی ہے۔"

شیخ عبداللہ

(اخباری بیان، ۱۰ جنوری ۱۹۵۸ء)

رہائی اور دوبارہ گرفتاری

۱۰ر جنوری ۱۹۵۸ء کی صبح کے اخبارات سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ کل شام کو چار سال اور پانچ مہینے کی نظر بندی کے بعد شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا ہے اسی دن جموں و سری نگر کے بیشتر اخبار نویس کُد پہنچ گئے۔ جہاں اب تک شیخ عبداللہ نظر بند رہے تھے، اور ابھی وہیں مقیم تھے۔ انھوں نے اخبار نویسوں سے کھل کر باتیں کیں اور اس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ یہ گفتگو اگر بے کم و کاست ہمارے قومی اخبارات میں شایع ہو جاتی تو شکوک و شبہات اور بے اعتمادی کے وہ دل بادل شاید بڑی حد تک چھٹ جاتے جو پورے ملک پر عموماً اور نئی دہلی کے سرکاری حلقوں پر خصوصاً چھائے تھے۔ شیخ عبداللہ پہ اب تک جو الزامات لگائے گئے تھے، انھیں اگر صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے، تو شیخ عبداللہ کے اس بیان سے کم از کم یہ نتیجہ تو قطعی طور سے اخذ کیا جا سکتا تھا کہ ـــــ اب وہ کشمیر اور ہندستان کے تعلقات کا ایک نیا باب شروع کرنے پر مایل ہیں اور ان کی مزاجی کیفیت صلح پسندی کی طرف راغب ہے۔

شیخ عبداللہ کی اس پہلی کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ جموں کے ایک غیر معروف ہفتہ وار اخبار "سچ" کی اشاعت مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ء میں شایع ہوئی تھی۔ ریاست میں بھی کم ہی لوگوں نے اسے پڑھا ہوگا، اور ریاست

کے باہر اس کے پڑھے جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ذیل میں اسی اخبار کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں:

رہائی کی داستان

"میری رہائی کی داستان بھی عجیب ہے" شیخ عبداللہ نے اخبار نویسوں کو بتایا" بدھ کی شام کو انسپکٹر جنرل پولیس آیا اور کہا کہ آپ کو کُد جیل سے سری نگر منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ ایک قیدی کی حیثیت سے میں وادیٔ [کشمیر] میں جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور اگر جبراً مجھے لے جایا گیا تو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنی جان دے دوں گا۔ پھر میری لاش آپ پنڈت نہرو کو بھیج دیجئے گا[1]۔ اس پر مجھ سے کہا گیا کہ مجھے صرف سری نگر تبدیل

[1] شیخ عبداللہ کے اس جملے سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ جواہر لال نہرو سے انھیں شکایت تھی، بلکہ اس سے بوئے یگانگت بھی آتی ہے اور جواہر لال نہرو کے ساتھ ان کا قلبی تعلق بھی ظاہر ہوتا ہے۔

شیخ عبداللہ اگر یہ سمجھتے تھے کہ ان کی برطرفی و گرفتاری کی براہ راست ذمے داری جواہر لال نہرو کی تھی، تو ان کا خیال صحیح نہیں تھا۔ جواہر لال نہرو کو تو "ان واقعات کی اطلاع سنیچر ۸ر اگست ۱۹۵۳ء کی رات کے گیارہ بجے ملی" اور یہ وہ وقت تھا جب کہ تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا۔ یا یوں کہئے کہ شیخ عبداللہ کی برطرفی اور بخشی غلام محمد کے وزیر اعظم بنائے جانے کی اطلاع جواہر لال نہرو کو ساتھ ساتھ ملی۔

کرنا ہی مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے پس پردہ رہا کرنا ہے۔ یہ سن کر میں نے کہا کہ اس وقت ساڑھے پانچ بجے ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت چل کر آدھی رات کو کشمیر میں داخل ہونے میں کیا بھید ہے۔ میرے ہمراہ سامان بھی ہے، اور اس کے لئے ٹرانسپورٹ کا انتظام بھی ضروری ہے۔ آدھی رات کو گھر پہنچوں گا، اور لوگ مجھ سے ملنے آئیں گے۔ میں نے بنگلے اور کوٹھیاں نہیں بنوائی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عوام کے اژدھام سے وہ گر جائے۔ یا سردی میں پڑوسی عورتیں آئیں تو اس غنڈہ گردی کے دور میں ان میں سے کسی کی بے عزتی ہوجائے۔ اس لئے میرے نزدیک اس وقت کی روانگی اچھی نہیں۔
اگر ٹرانسپورٹ مہیا کردیا جائے تو میں صبح سویرے روانہ ہوجاؤں گا۔ مگر بجائے اس کے [کہ ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے] مجھے تین سو روپے دے کر ڈاک بنگلے میں چھوڑ دیا گیا۔ میں ٹرانسپورٹ کے انتظار میں ہوں، جب اس کا کوئی انتظام ہوگا تو میں سری نگر روانہ ہوجاؤں گا۔

حکومت نے اگر ڈاک بنگلہ خالی کرنے کے لئے مجھ سے کہا، تو یہاں میرا کوئی دوست نہیں ہے، اور کوئی مسجد بھی یہاں نہیں ہے، مندر میں گیا تو ممکن ہے کہ چھوت چھات کی وجہ سے وہاں بھی مجھے نہ ٹھہرنے دیا جائے۔ مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ایک گردوارہ ہے، میں وہاں چلا جاؤں گا۔ یقین ہے کہ وہاں سے مجھے کوئی نہ نکالے گا، کیوں کہ گردوارے میں جو بھی چلا جائے، وہاں رہ سکتا ہے اور اسے وہاں کھانے کو بھی مل جاتا ہے۔ اور اگر

پھر بھی [ٹرانسپورٹ کا] انتظام نہ ہوا تو میرے گرد جو رفیق کار جمع ہیں انھیں ساتھ لے کر دنو بھابھاوے کی طرح میں پیدل ہی چل پڑوں گا"

"میں نے گاندھی جی کے آدرش کی پابندی کی"

ایک سوال کے جواب میں شیخ عبداللہ نے کہا:
"میں وہی شیخ عبداللہ ہوں، جو ۱۹۴۷ء میں تھا —— جب دوسری جگہوں پر قتل کیا جارہا تھا، تو میں نے گاندھی جی کے آدرش کی پابندی کی، اور اب بھی اس پر کاربند ہوں۔ ہندستان میں گاندھی جی مجھے روشنی کی کرن دکھائی دیتے تھے، اور وہی ایک ایسی شخصیت تھی، جو سچائی اور اصولوں کے لئے زندہ رہی۔ ہندستان ہی گاندھی جیسی شخصیت وجود میں لاسکا، جو مسلمانوں کے لئے جان تک قربان کے لئے ہر وقت تیار رہی [اور جس نے مسلمانوں کے لئے جان قربان کر بھی دی]۔ میں نے عوام سے اکثر یہ کہا ہے کہ وہاں [گاندھی کے ہندستان میں] دھوکا نہیں ہوسکتا۔ اور ہندستان و پاکستان کا ہوا باہمی ڈر اور خوف پر مبنی ہے۔ مجھے اس ڈر اور خوف کو دور کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے میں جو عمارت بنا رہا تھا، کچھ لوگ اسے مسمار کرنے کے درپے تھے میں ایک نظریاتی جنگ لڑ رہا تھا، مگر ضرورت کے مطابق مجھے مسالہ مہیا نہیں کیا گیا، تو پھر میں اس مقصد میں کامیاب کیسے ہوسکتا تھا۔ میرے سامنے اب بھی وہی اصول ہیں اور میں ہندو، مسلم اور سکھ میں کوئی تمیز نہیں کرسکتا"

پنڈت نہرو ـــــ "جیسے میں ان کے کنبے ہی کا فرد ہوں"

"جہاں تک پنڈت نہرو کا تعلق ہے، آج بھی میرے دل میں ان کا گہرا احترام ہے، آخر میں اس بات کو کیوں کر بھول سکتا ہوں کہ انھوں نے مجھ سے ہمیشہ محبت اور شفقت کا سلوک کیا ہے، جیسے میں ان کے کنبے ہی کا فرد ہوں۔"

اپنی گرفتاری کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

"جہاں تک پنڈت نہرو کا تعلق ہے، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں، کہ پنڈت جی کو [اس کے لئے] مجبور کیا ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پنڈت جی کو جیل سے بھی تار دیا تھا اور دریافت کیا تھا کہ وہ میری غلطیاں بتائیں۔ میں نے یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ بہ حیثیت دو وزیر اعظموں کے میری اور پنڈت جی کی باہمی خط و کتابت جو ۹ اگست ۱۹۵۳ء سے قبل ہوئی تھی، شایع کی جائے، اس سے میری پالیسی کا پتا چل سکتا ہے۔"

سازش کیوں کی گئی؟

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا:

"میں نے اپنے گھر [کشمیر] میں کچھ ایسی باتیں کیں، جنھیں ہندستان کے کچھ لوگ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے بلا معاوضہ زمین داری کا خاتمہ کیا، قرضہ، وراثتی حکومت اور رہن وغیرہ کے قوانین بنائے جس کی وجہ سے میرے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ میں عوام کو اچھا ایڈمنسٹریشن دینا چاہتا تھا، جس کے لئے میں کسی چپراسی

یا کلرک کے خلاف کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ یہ برائی تو اوپر سے شروع ہوئی ہے۔ میرے ایسے بھی ساتھی تھے، جنھوں نے لاکھوں روپے بنائے ہیں۔ میں نے مطالبہ کیا کہ ان کی تحقیقات کی جائے۔ مگر یہاں تو مرکزی سی، آئی، ڈی اور میرے افسروں کو بھی گمراہ کر دیا گیا۔ بخشی کروڑوں روپے ہندستان سے لایا تھا۔ ہندستان کے معدودے چند اخباروں کو چھوڑ کر سارے پریس کو بھی گم راہ کیا گیا۔ پریس سے مجھ پر یہ الزام لگوایا گیا کہ بیرونی ممالک سے میں سازش کر رہا ہوں، اور کشمیر کو آزاد رکھنے کے لئے میں نے امریکہ سے سازباز کی تھی۔ یا امریکی ڈیماکریٹک پارٹی کے لیڈر ایڈلائی اسٹونسن سے اس وقت کچھ بات چیت کی تھی جب وہ کشمیر [مئی ۱۹۵۳ء] میں آئے تھے۔ مگر واضح رہے کہ ایڈلائی اسٹونسن سے میں اکیلا نہیں ملا تھا۔ میرے تین چار افسر بھی میرے ساتھ تھے، اور پھر ملا بھی تھا پنڈت جی کی ہدایت کے مطابق۔ ایڈلائی اسٹونسن ابھی زندہ ہیں، ان سے بھی حقیقت حال معلوم کی جا سکتی ہے[1] اسی بنا پر میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس الزام کی تحقیقات کرائی جائے اور اگر میں قصور وار نکلوں تو مجھے واقعی سزا دی جائے، ورنہ میرے

---

۱ شیخ عبداللہ کو اس کا علم نہیں تھا، اور ملک میں بھی کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ ایڈلائی اسٹونسن نے ۱۴ اگست ۱۹۵۳ء کو ایک بیان جاری کیا تھا، جس میں اس نے قطعیت کے ساتھ اس الزام کی تردید کی تھی۔ دیکھئے:

Keesing's Contemporary Archives : 1953, p. 13127.

ساتھ انصاف کیا جائے۔

"ان ساڑھے چار برسوں میں ہند سے کشمیر کا رشتہ مضبوط ہوا؟"

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ صاحب نے شکایتاً کہا:

"پنڈت جی بھی شاید میرے طریق کار سے متفق نہ تھے، اپنے طریق کار پر چلانے کے لئے انھوں نے بخشی غلام محمد کو موزوں سمجھا اور مجھے اس پر قربان کر دیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان ساڑھے چار برسوں میں [میری قید کے دوران] ہند سے کشمیر کا رشتہ مضبوط ہوا ہے؟ اگر ہندستان کو پانچ فی صدی بھی اپنا اعتماد بڑھانے میں فایدہ ہوا ہو، یا تری نہر و کے دیش [کشمیر] کے چالیس لاکھ لوگوں کا بھلا ہوا ہو، تو بلاشبہ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے۔ مجھے اس کا قطعاً گلہ نہ ہوگا، کیوں کہ اپنے دوستوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا میں نے نہیں سیکھا ہے، اور نہ دوستوں کے خلاف کبھی سازش اور غداری کی ہے۔"

میں فرقہ پرست نہیں ہوں

"۱۹۳۱ء میں ہم نے آزادی کی جدوجہد شروع کی تو لوگوں نے مجھے کٹر فرقہ پرست کہا، لیکن ۱۹۴۷ء میں [عین اس وقت جب کہ گرد و پیش فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا] میں نے ثابت کر دیا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، میں نے اپنے عمل سے اس پر مہر تصدیق بھی لگا دی۔ میرے لئے یہ بڑا امتحان تھا، اور میں اس میں کام یاب رہا۔ اور اب بھی اگر وقت آئے تو پھر میں

اس امتحان میں کام یاب نکلوں گا۔ شیخ عبداللہ اپنے ضمیر کا سودا عہدوں اور روپے سے نہیں کر سکتا، اور نہ وہ فوجوں سے ڈرتا ہے۔ وہ صرف خدا کے سامنے جھک سکتا ہے۔ وزارت عظمیٰ میرے لئے مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، بجائے خود منزل نہیں ہے۔ میں اپنے ملک میں ۱۹۴۷ء کو پھر دُہرانے نہیں دوں گا۔"

"مجھے ہندستان کا دشمن نہ سمجھیں"

اخباری نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے مزید کہا:

"آپ مجھے ہندستان کا دشمن نہ سمجھیں۔ ہندستان [کی تقسیم اور] پاکستان کے بننے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ریاست کا آخری حل عوام ہی کی رائے سے ہوگا، اور میں موجودہ حکومت کو بھی قانونی و آئینی تسلیم نہیں کرتا۔

"ہندستان و پاکستان کے درمیان باہمی رواداری کی ضرورت ہے، تاکہ دونوں ملکوں کے لوگ، دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کا رتبہ حاصل کر سکیں۔ اگر ہم جنگ کو خارج از امکان کر دیں، اور ایسا نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، تو پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم پُرامن حل کو حقیقت بنا ڈالیں۔ ہندستان و پاکستان یا جموں و کشمیر کے اندر جو لوگ کھینچا تانی اور کشیدگی کو بڑھا رہے ہیں، وہ اپنے اپنے عوام کے دشمن ہیں۔"

"بیرونی طاقتوں سے سازباز کا گھناؤنا الزام"

"آپ کو یاد ہوگا کہ کس طرح غیرآئینی اور غیرقانونی طور پر مجھے وزارتِ عظمٰی سے الگ کیا گیا اور چند بیرونی طاقتوں سے سازباز کرنے کا گھناؤنا الزام اکثر ہندستانیوں کی طرف سے لگایا گیا۔ اگر آج بھی میں اس الزام میں قصوروار ثابت ہوں تو ہندستان کے ایک ایک شہری سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں، ورنہ برسرِاقتدار لوگوں پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کی تلافی کریں۔"

"ریاست کا نیا آئین تسلیم کرنے سے مجھے معذور سمجھا جائے"

"میں [اپنی رہائی کے بعد] اس دوران میں لوگوں کی نبض شناسی کی کوشش کروں گا۔ ایک طویل مدت کے بعد میں اُن سے مل رہا ہوں۔ جہاں تک ریاست کے نئے آئین کا تعلق ہے، اسے تسلیم کرنے سے مجھے معذور سمجھا جائے۔ کیوں کہ یہ آئین عوام پر ایک ایسی اسمبلی نے ٹھونسا ہے، جس کے ممبروں کی اکثریت ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی سازش کے بعد عوام کا اعتماد کھو بیٹھی تھی۔"

ڈاکٹر شیاما پرشاد کی وفات کا سانحہ

شیخ عبداللہ کی ہندستان سے دوری کے اسباب میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی اچانک وفات کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ جموں کی پرجا پریشد کی تحریک کی طرف گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے،

جس کی قیادت عملاً جن سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں ریاست جموں وکشمیر میں داخل ہونے کے لئے حکومتِ ہند نے پرمٹ سسٹم جاری کیا تھا، جو دہلی میں وزارتِ دفاع دیتی تھی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کا بھی علانیہ ارادہ ظاہر کیا تھا، کیوں کہ جن سنگھ اس پرمٹ سسٹم کے خلاف تھی۔ چناں چہ ۸ مئی ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی جموں کے دورے پر روانہ ہوئے۔ ان کا ارادہ شیخ عبداللہ سے ملنے کا بھی تھا، جس کی طرف انھوں نے اپنے اُس بیان میں اشارہ بھی کیا تھا، جو روانگی سے قبل دیا گیا تھا۔ ریاست جموں وکشمیر کے حدود میں داخل ہوتے ہی پولیس کے ایک افسر نے ریاست کے حدود میں ان کے داخلے کی ممانعت کا نوٹس ان کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور انھیں گرفتار کرکے سری نگر لایا گیا، جہاں کچھ روز کے بعد قلب کے عارضے میں وہ اس دنیا سے چل بسے۔ اس سانحے کی ساری ذمے داری شیخ عبداللہ پر ڈال دی گئی اور اس کے لئے پورے ملک میں انھیں مطعون کیا گیا۔ اسی سلسلے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے شیخ عبداللہ نے جو کچھ کہا اس کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت ہوم منسٹر بخشی غلام محمد تھے اور جیل وصحت کا محکمہ صراف کے پاس تھا۔ انھوں نے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی اچانک موت کی تحقیقات کرائی جائے، تاکہ اصل مجرم لوگوں کے سامنے آجائیں۔ تعجب ہے کہ جن سنگھ اور پرجا پریشد نے کیوں اپنے اس مطالبے کو چھوڑ دیا، اور انھوں نے میری رہائی کی مخالفت کیوں شروع کر دی!

”میری یہ انتہائی خواہش تھی کہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کو دہلی بھیج دیا جائے۔ مگر لا اینڈ آرڈر کی ذمے داری میرے کندھوں پر نہ تھی، اور جو لوگ اس کے ذمے دار تھے، وہ کسی سازش میں مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی موت سے قبل، میری خواہش کے باوجود، مجھے ان کی حالت سے باخبر نہ رکھا گیا، ۷ بجے دن کو یہ خبر مجھے دی گئی کہ وہ چل بسے ہیں“

ساڑھے چار سال کی نظربندی کے بعد شیخ عبداللہ نے جو پہلا اور طویل بیان دیا تھا، اس کے مندرجہ بالا اقتباسات کا اگر سرسری بھی مطالعہ کیا جائے تو ہلکی سی ترشی تو ضرور محسوس ہوگی، لیکن تلخی کا شائبہ بھی نظر نہ آئے گا۔ البتہ جہاں بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کا ذکر آیا ہے وہاں، قدرتی طور پر، ان کا لہجہ یقیناً تند و تیز ہو گیا ہے۔

غیر ملکی طاقتوں سے گٹھ جوڑ کرنے کے جو الزامات ان پر لگائے گئے تھے انھیں ”گھناؤنے الزام“ سے انھوں نے تعبیر ہی نہیں کیا، بلکہ اس کی تفتیش کا بھی بار بار مطالبہ کیا۔

گاندھی وادی ہونے اور گاندھی جی کی تعلیمات پر کاربند رہنے کا بھی انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا۔ جواہر لال نہرو کا نام انھوں نے احسان مندی کے ساتھ لیا، اگرچہ دبے لفظوں میں اس کی شکایت بھی کی کہ بخشی غلام محمد کی چالوں میں پھنس کر جواہر لال نہرو نے بخشی غلام محمد پر انھیں قربان کر دیا۔

یہ بیان ایسا تھا کہ اس کے بعد گفت و شنید کے باب کا یقیناً آغاز ہونا چاہیے تھا، لیکن اس کی نوبت نہ آئی، جس کے اسباب آگے آنے والے

صفحات بیان کریں گے۔

رہائی کے اسباب

چار سال اور پانچ مہینے کی طویل نظربندی کے بعد ۱۹۵۸ء کے اوائل میں شیخ عبداللہ کو تین مہینے اور بیس دن کی مختصر مدت (۸ جنوری تا ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء) کے لئے رہا بھی کیا گیا، تو ان کی یہ رہائی غالباً ایک عظیم تر منصوبے کے تحت عمل میں آئی تھی۔ ایک تو ان کی مسلسل نظربندی ملک کے بعض حلقوں میں جمہوریت کے منافی سمجھی جانے لگی تھی اور اس کے خلاف احتجاج کی دبی دبی صدائیں بھی اٹھنے لگی تھیں، اور ان کی برطرفی و گرفتاری کے جو ڈرامائی اسباب بیان کئے گئے تھے، ان کی صداقت بھی مشتبہ سمجھی جانے لگی تھی۔ ان ہی حالات کی بنا پر یکایک شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن انھیں رہا کرنے سے پہلے شاید اس امر کا بھی پورا التزام کیا گیا تھا کہ رہائی کے بعد اپنی تقریروں میں وہ جن خیالات کا اظہار کریں وہ اپنی صحیح شکل میں جلسہ گاہ کے باہر عوام کیا خواص تک بھی نہ پہنچیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے وقت جو سنگین الزامات ان پر عاید کئے گئے تھے، اور جو ساڑھے چار سال تک، ان کی نظربندی کے دوران، طرح طرح سے دہرائے گئے تھے ان کی تردید میں شیخ عبداللہ نے جو بیانات دئے اور جو تقریریں کیں وہ بھی اس درجہ مسخ ہو کر عوام کے سامنے آئیں کہ ان کی وہ تصویر جو عام ذہنوں پر نقش کی گئی تھی، اور بھی مسخ ہو گئی۔ وہ لوگ جو شیخ عبداللہ کی پہلی گرفتاری کو غیر دانش مندانہ اقدام سمجھ رہے تھے انھیں بھی یقین ہو گیا کہ شیخ عبداللہ کے خلاف جو قدم ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو اٹھایا گیا تھا وہ صحیح تھا۔

جواہر لال نہرو کے نام شیخ عبداللہ کا خط

اس صورت حال کا احساس، قدرتی طور پر، شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کو بھی تھا۔ اسی کے پیش نظر غالباً مولانا سعید مسعودی نے شیخ عبداللہ کو اس بات پر آمادہ کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا کہ ہندستان کے وزیر اعظم اور اپنے پرانے دوست جواہر لال نہرو کو سابقہ و حالیہ صورت حال سے آگاہ کریں۔ چناں چہ شیخ عبداللہ نے جواہر لال نہرو کو خط لکھا، جس میں پہلی بات انھوں نے یہی لکھی کہ:

" بخشی غلام محمد اور ان کے حامی، اپنی گزشتہ غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے، میری سرگرمیوں کو قصداً و عمداً غلط اور شر انگیز طریقے سے خود پیش کر رہے ہیں یا دوسروں سے پیش کرا رہے ہیں۔"

اسی خط میں دوسری اہم بات جو شیخ عبداللہ نے لکھی، وہ یہ تھی:

" ۱۹۵۳ء میں آپ کو اور آپ کے بعض رفقا کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے میں انھیں [بخشی غلام محمد کو] کامیابی ہوئی، جس کا نتیجہ اسی سال ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے سانحے کی شکل میں نمودار ہوا۔"

اس خط کے مزید اقتباسات پیش کرنے سے بہتر ہے کہ خط کا پورا ترجمہ ہی پیش کر دیا جائے، جو شیخ عبداللہ کے کرب ہی کا نہیں بلکہ ان کے ذہنی پیچ و تاب کا بھی آئینہ دار ہے۔ اسے پڑھنے سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ خط ایک ایسے شخص نے لکھا تھا جس کے ساتھ شدید ناانصافی

کی گئی تھی، اور یہ ایک ایسے شخص کو لکھا گیا تھا جو، کم از کم شیخ عبداللہ کے یقین کے مطابق، اس ناانصافی کو بروئے کار لانے میں، غیر ارادی طور ہی پر سہی، مگر آلۂ کار بنا تھا۔ اسے پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوگا کہ لکھنے والے نے بہت ہی مجبور ہو کر یہ خط لکھا ہے، اور اس سے اس کی انا کو شدید ٹھیس لگی ہے۔ اور آخر میں تو شیخ عبداللہ نے یہ لکھتے ہوئے اپنی خودی کو یک سر بالائے طاق رکھ دیا تھا کہ " میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کی اختیار کردہ پالیسی سے آپ دھوکا نہ کھائیں۔"

خط کا ترجمہ

" سری نگر

" ۱۱ر اپریل ۱۹۵۸

" محترمی پنڈت جی!

" جب سے مجھے نظر بندی سے رہا کیا گیا ہے، بخشی غلام محمد اور ان کے حامی اپنی گزشتہ غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے میری سرگرمیوں کو قصداً و عمداً غلط اور شر انگیز طریقے سے خود پیش کر رہے ہیں یا دوسروں سے پیش کرا رہے ہیں۔ یہ بے حد افسوس ناک بات ہے کہ اس پروپگنڈے کی آڑ میں مختلف طبقوں کے، سیکڑوں کشمیریوں کو، جن میں وکیل، ڈاکٹر، تاجر، ریاست کے سابق وزرا اور سابق ممبران لوک سبھا بھی شامل ہیں، بلا کوئی جرم عاید کئے ہوئے حراست میں رکھا گیا ہے یا جھوٹے اور بے بنیاد

فوج داری مقدمات میں پھنسایا گیا ہے، اور مختلف حوالاتوں میں ان کے ساتھ ناروا و جابرانہ سلوک کیا جا رہا ہے۔ جو کھانا اور ضروریات زندگی انھیں مہیا کی جاتی ہیں ان کی قیمت بہ مشکل دس آنے یومیہ ہوتی ہے۔ انھیں اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ اپنے لئے بستر کا انتظام کریں یا اپنے گھروں سے کھانے پینے کی چیزیں منگا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ جو سلوک برتا جا رہا ہے، اس سے بھی برا ہے جو جیل کے حکام اخلاقی مجرموں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پولیس جان بوجھ کر کسی عدالت میں ان کا چالان نہیں کرتی تاکہ گرفتار شدگان کو زیادہ مدت تک اپنی تحویل میں رکھ کر انھیں روحانی و جسمانی اذیتیں پہنچاتی رہے۔ معزز شہریوں کو حکومت ہند کے انٹلی جنس بیورو میں رکھا گیا ہے، جہاں انھیں ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ نازی کیمپوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے جھوٹے بیانات دیں یا ایسے بیانات پر دستخط کریں، جن کی مدد سے عوامی رہنماؤں کو بغاوت کے جرم میں پھنسایا جا سکے۔ ڈفنس رولز کی دفعہ ۵۰ کی رو سے عام جلسوں اور جلوسوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اس دفعہ کے نفاذ سے ساری وادی کو شہرِ خموشاں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سی، آر، پی [سنٹرل رِزرو پولیس]، پیس بریگیڈ، ملیشیا اور پولیس کو، عوام کے ذہنوں میں خوف و دہشت پیدا کرنے کے لئے شہروں ہی میں نہیں، وادی کے طول و عرض

میں بلکہ ضلع ڈوڈا تک پھیلا دیا گیا ہے۔ بلا وجہ جھوٹے الزامات لگا کر لوگوں کو گرفتار کر کے حوالاتوں میں بند کیا جاتا ہے اور وہاں انھیں سخت اذیتیں دی جاتی ہیں۔ میں یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا ہوں کہ اس حصے میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ہندستان کی جمہوری مشنری کیسے چل رہی ہے؟ مگر میری خاموشی اور ساتھ ہی کچھ نہ کرنا بھی ۱۹۵۳ء میں سازش کرنے والوں کی نیندیں حرام کر رہا ہے، اور وہ پھر اس جوڑ توڑ میں ہیں کہ کسی طرح دوبارہ مجھے جیل خانے میں ڈال دیں۔

" مجھے تعجب ہوا جب بخشی غلام محمد نے حال ہی میں حیدر آباد و بمبئی میں تقریریں کرتے ہوئے مجھ پر یہ بے بنیاد الزام لگایا کہ میں رضاکاروں کی بھرتی کر رہا ہوں اور اس کے لئے روپیہ جمع کر رہا ہوں تاکہ کسی موزوں و مناسب وقت پر پوری طاقت کے ساتھ حکومت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ ایک ایسے شخص کی ایک اور اختراع ہے، جس نے نہ صرف کشمیری عوام سے بے وفائی کی بلکہ اپنے محسن کو بھی، خود اقتدار حاصل کرنے کے لئے، دغا دی تاکہ رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے اپنے خاندان کے لئے دولت اکٹھی کر سکے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ کو اور آپ کے کچھ رفقائے کار کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے میں انھیں کامیابی ہوئی، جس کا نتیجہ اسی سال ۹ اگست کے سانحے کی صورت میں رونما ہوا۔ پھر مجھ پر یہ الزام لگایا کہ ریاست

کو خود مختار بنانے کے لئے میں نے ایک غیر ملکی طاقت سے ساز باز کی ہے۔ اس الزام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہ خط و کتابت شایع کرنے کی بھی دھمکی دی جو میں نے مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم رفیع احمد قدوائی اور آپ کے ساتھ کی تھی۔ لیکن اسے شایع کرنے کی اسے اب تک ہمت نہیں ہوئی ہے۔ چوں کہ ان جھوٹے الزام کو وہ باور نہیں کرا سکے، اس لئے اب پھر وہی پرانا کھیل کھیل رہے ہیں، اور دہلی و کشمیر میں رہنے والے اپنے معاون سازشیوں کے ساتھ مل کر میری سرگرمیوں کے متعلق ملک کے اندر شر انگیز فضا پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ایسے شخص سے دھوکا نہ کھائیں گے، جو ادب و اخلاق سے بھی عاری ہے۔

" آپ تو بخوبی واقف ہیں کہ میں سازشوں اور دروغ بافیوں میں کبھی نہیں پڑتا۔ ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے حکومتِ ہند کی اس پالیسی سے اختلاف ہے، جو کشمیر کے باب میں اس نے اختیار کر رکھی ہے۔ اپنے ان خیالات کو میں نے کسی سے پوشیدہ بھی نہیں رکھا۔ اس دس سالہ جھگڑے کو ختم کرنے کا، میرے خیال میں، یہی ایک منصفانہ اور صحیح طریقہ ہے کہ کشمیری عوام کو ان کا حق خود ارادیت دیا جائے۔ اور یہ وہ مطالبہ ہے جس کی تائید و حمایت ایک زمانے سے آپ بھی بڑے جوش و خروش سے کرتے آئے ہیں، اور جس کے تحفظ کے لئے حکومتِ ہند نے ۱۹۴۷ء میں اپنی مسلح فوج بھی بھیجی تھی۔

" مجھے کامل یقین ہے کہ ہمارا مطالبہ انصاف پر مبنی ہے، اور وہ دن دور نہیں جب پوری دنیا کی رائے ہماری تائید کرے گی اور ہندستان کو ہمارا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا۔ اس سے کوئی فایدہ نہیں کہ اس مقصد کے لئے ریاست میں داخلی بدامنی پیدا کردوں، یا حکومت کا، خواہ کسی بھی نوع کی ہو، تختہ الٹوں۔ بلاشبہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کشمیر اور ہندستان کے ہر طبقے کے لوگوں میں منظم رائے پیدا کردوں تاکہ کشمیر کے بارے میں دو عظیم ہمسایوں —— ہندستان و پاکستان کے مابین جو تنازعہ ہے، وہ ریاستی عوام کی خواہش کے مطابق جلد سے جلد طے پائے، اور کشمیری عوام کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع بلا کسی اندرونی و بیرونی رکاوٹ اور خوف کے مل جائے۔

" ان تمام واقعات کے باوجود، جو اگست ۱۹۵۳ء میں رونما ہوئے تھے، مجھے اب بھی یقین ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کنجی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بخشی غلام محمد اور ان کے ساتھیوں کی اختیار کردہ پالیسی سے آپ دھوکا نہ کھائیں، ورنہ یہ آخر کار سب کے لئے تباہ کن ہوگا۔

" مجھے امید ہے کہ آپ سب بخیریت ہوں گے

" آپ کا مخلص

" محمد عبداللہ

" بگرامی خدمت انرایبل پنڈت جواہر لال نہرو

" وزیر اعظم حکومت ہند۔ نئی دہلی"

دوبارہ گرفتاری کے حقیقی اسباب

مندرجہ بالا خط لکھنے کے اٹھارہویں دن شیخ عبداللہ کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری سے چند ہی روز پہلے وجے لکشمی پنڈت دہلی سے سری نگر آئی تھیں۔ گمان غالب ہے کہ جواہر لال نہرو ہی نے شیخ عبداللہ کا خط پڑھنے کے بعد انھیں حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا ہوگا۔ اس سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے وجے لکشمی پنڈت اور شیخ محمد عبداللہ کی ملاقات بھی طے ہو گئی تھی۔ لیکن اس ملاقات کے بر روئے کار آنے سے پہلے ہی شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ عبداللہ کے ساتھ جو اور لوگ گرفتار ہوئے تھے، ان میں کشمیر کے ایک ممتاز سیاسی کارکن پنڈت کیشب بندھو بھی تھے۔ انھوں نے اپنی نظربندی کے خلاف جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں ہیبیس کورپس درخواست دی تھی۔ اس درخواست میں اپنی گرفتاری کے جو اسباب انھوں نے بیان کئے تھے، ان سے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے لکھا تھا:

"بدقسمتی سے جن اسباب نے ہندستان کے ساتھ کشمیر کے تعلقات کو متاثر کیا ہے، ان میں وہ ناخوش گوار تعلقات بھی ہیں، جو شیخ محمد عبداللہ اور حکومت ہند کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اس لئے درخواست دہندہ نے، ہندستان کے وفادار شہری کی حیثیت سے، اپنا یہ فرض منصبی سمجھا کہ اپنی تمام کوششوں کا رخ ان کشیدگیوں کو کم کرنے اور تعلقات کو

استوار کرنے کی جانب موڑ دے۔

"درخواست دہندہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی کوششیں کامیاب ہوتی نظر آنے لگی تھیں چناں چہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شیخ صاحب نے وزیر اعظم ہندستان پنڈت جواہر لال نہرو کو خط لکھا، جس میں انھوں نے ان تمام اتہامات کی تردید کی جو ہندستانی پریس اور حکومت کشمیر کے سرکردہ ترجمان نے ان پر لگائے تھے۔

"... محولہ بالا کوشش کو آگے بڑھانے ہی کے لئے درخواست کنندہ نے شیخ صاحب کی فوری خواہش کی تعمیل میں ان کے اور شری متی وجیا لکشمی پنڈت، ہائی کمشنر برائے ہند متعینہ لندن، کے مابین ملاقات کا انتظام کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں درخواست دہندہ شری متی وجے لکشمی پنڈت سے، اپنی گرفتاری سے دو روز قبل ملا بھی تھا، اور متذکرہ صدر ملاقات کا اہتمام کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ درخواست دہندہ کو یہ یقین تھا کہ یہ ملاقات شیخ محمد عبداللہ اور حکومت ہند کے تعلقات کو بہتر بنانے کا پہلا زینہ ثابت ہوگی۔

"... بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے درخواست کنندہ کی اس کوشش کو پسندیدہ نگاہوں سے نہ دیکھا کہ شیخ محمد عبداللہ اور حکومت ہند، خاص طور پر وزیر اعظم ہند، کے درمیان از سرِنو تعلقات قایم ہوں اور بہتر مفاہمت ہو۔

"اور یہ کہ جب وجیا لکشمی پنڈت کے ساتھ درخواست دہندہ

کی ملاقات کا اور اس امر کا علم ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم کو ہوا کہ ایک ایسا عملی اسٹیج قایم کرلیا گیا ہے جس سے انجام کار باہمی رنجش اور شک وشبہ کے وہ بادل چھٹ جائیں گے، جنھوں نے اپنا منحوس سایہ شیخ محمد عبداللہ اور حکومت ہند کے باہمی تعلقات پر ڈال رکھا ہے، تو اس خوش آئند کارروائی کو روکنے کے لئے انھوں نے شیخ عبداللہ اور درخواست دہندہ کو بلاوجہ اور بے قصور گرفتار کرلیا...."

صادق صاحب کا احتجاجی بیان اور جواہر لال نہرو کے نام تار

مندرجہ بالا اقتباس ایک ایسے شخص کے تحریری بیان سے اخذ کیا گیا ہے، جو شیخ محمد عبداللہ کا ساتھی اور ہم نوا ہے، اور جسے شیخ عبداللہ کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا تھا، اور یہ بیان اس نے اپنی صفائی میں داخل کیا تھا. اس لئے اسے یک طرفہ بھی سمجھا جاسکتا ہے. لیکن اس کے اندراجات کی تائید خواجہ غلام محمد صادق کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے جو شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے فوراً بعد انھوں نے دیا تھا. اس میں اور باتوں کے علاوہ انھوں نے کہا تھا کہ:

" شیخ کی گرفتاری سے کشمیر کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا ہے، خاص کر ایسے وقت میں جب کہ وہ عوام سے پرامن رہنے کی

اپیل کر رہے تھے. انھوں نے ان پابندیوں کی خلاف ورزی بھی نہیں کی تھی جو عوام پر لگائی گئی تھیں. اور یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے پنڈت نہرو کو خط لکھا تھا، جس میں، ان کے پرانے موقف کے علاوہ جسے وہ بارہا دہرا چکے تھے، تین نکات خصوصیت سے قابل غور ہیں:

"۱ یو، ان، او کی فوج کو ریاست میں وہ نہیں لانا چاہتے.

"۲ مسئلہ کشمیر کا حل پنڈت نہرو کے ہاتھ میں ہے.

"۳ حصول مقاصد کے لئے وہ پرامن ذرائع استعمال کریں گے ــــ"

اس اخباری بیان کے علاوہ صادق صاحب نے، جو اس وقت ڈماکرٹیک نیشنل کانفرنس کے صدر تھے، پنڈت نہرو کو ایک احتجاجی تار بھی بھیجا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ:

" شیخ عبداللہ کی گرفتاری کو ہم بدقسمتی پر محمول کرتے ہیں. سیاسی حالات اس وقت روبہ اصلاح ہو رہے تھے. پرامن اور معتدل حالات میں [شیخ عبداللہ کو گرفتار کرنے کا] یہ اقدام قطعاً غیر منصفانہ ہے. اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ یہاں کے عوام کے اور ان حکام کے تعلقات، جو امن و امان کے ذمے دار ہیں، اور زیادہ خراب جائیں. ہم بڑے دکھ سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت کشمیر کے ان

اقدامات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے...

"ہم ایک بار پھر آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ ہمارے معاملات میں مداخلت کر کے دہشت انگیزی کے اس دور کو ختم کیجیے اور حالات کو اعتدال پر لائیے۔ اس سے آپ کشمیریوں کو مایوسی و ناامیدی کے لاعلاج مرض سے نجات دلا سکیں گے۔"

ڈیماکریٹک نیشنل کانفرنس اور نیشنل کانفرنس میں مفاہمت ہو جانے اور بخشی وزارت میں صادق صاحب اور ان کے ساتھیوں کے دوبارہ شامل ہو جانے کے بعد بھی شیخ عبداللہ کے متعلق صادق صاحب کے نظریے میں غالباً کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں سرینگر ہی میں انھوں نے ایک ملاقات کے دوران شیخ عبداللہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار راقم سے کیا، وہ ان سے مختلف نہیں تھے جو انھوں نے شیخ کی دوبارہ گرفتاری کے وقت اخباری بیان نیز جواہر لال نہرو کے نام تار میں ظاہر کیے تھے۔ اسی ملاقات میں صادق صاحب نے ایک سوال کے جواب میں یہ دل چسپ واقعہ بھی بیان کیا:

"شیخ صاحب ہمارے آزمودہ کار لیڈر رہیں" میں نے صادق صاحب سے کہا "ہندستان سے الحاق کے سلسلے میں ۴۸-۱۹۴۷ء میں ان کے جو خیالات تھے، ان میں ۱۹۵۳ء میں یقیناً انقلاب آیا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دس سال بعد آج بھی ان کے وہی خیالات ہوں، جو ۱۹۵۳ء میں تھے۔ وقتاً فوقتاً ان کے خیالات معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہونا چاہیے۔"

"آپ نے جو بات کہی ہے" انھوں نے جواب دیا "جواہر لال جی نے بھی آج سے کوئی چھ مہینے پہلے یہی بات مجھ سے اور زیادہ واضح الفاظ میں کہی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ میں شیخ سے ملوں اور بات کروں۔ اس ریاست میں میں ہی ایک ایسا آدمی ہوں، جو شیخ سے بات کر سکتا ہے، کیوں کہ میں نے ان کے ساتھ کوئی غداری نہیں کی ہے، میں نے ان کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپا ہے، وہ کبھی بھی میرے ایمان کا چھٹا رکن نہیں تھے۔ بلکہ میرے اور ان کے اختلافات بالکل عیاں تھے۔ میں پہلی بار ان سے ملوں گا تو وہ لڑیں جھگڑیں گے، لیکن دوسری بار وہ بات چیت اور بحث مباحثہ بھی کریں گے۔ لیکن میں نے جواہر لال جی سے کہا کہ میرے اور بخشی کے جو تعلقات ہیں، ان کے پیش نظر آپ کے اشارے پر شیخ سے میرا ملنا مناسب نہیں ہے۔ بخشی کو اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ بخشی سے کہیے کہ وہ مجھ سے شیخ سے ملنے کے لیے کہیں" صادق صاحب نے پھر کچھ رک کر کہا "اس بات کو چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ لیکن آج تک نہ تو بخشی نے اس بارے میں کچھ کہا، اور نہ جواہر لال جی ہی نے پھر اس کا ذکر کیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔"

"شیخ عبداللہ سیکولرازم کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جو ان کے اس اصول کو کسی نوع بھی مجروح کرے۔ اس دو قومی نظرئے کو بھی وہ نہیں مانتے جو قیامِ پاکستان کی اساس ہے۔"

جواہرلال نہرو

(آخری تقریر، آل انڈیا کانگرس کمیٹی منعقدہ بمبئی)

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

ستمبر ۱۹۶۴ء میں بخشی غلام محمد نے بھی "کامراج پلان" کے تحت اپنا استعفا جواہر لال نہرو کے حوالے کردیا۔ ان کا یہ اقدام شاید اس خوش فہمی کا نتیجہ تھا کہ وہ قبول نہ کیا جائے گا، لیکن جواہر لال نہرو نے اسے قبول کرلیا، اور ان تمام "مظاہروں" کے باوجود جو استعفا واپس کئے جانے کے لئے سری نگر میں ہوئے وہ اپنے فیصلے پر قایم بھی رہے۔

نئے دَور کا آغاز

پورے ملک کو یقین تھا کہ بخشی غلام محمد کی جگہ خواجہ غلام محمد صادق ریاست کے وزیر اعظم ہوں گے، لیکن خلاف توقع نیشنل کانفرنس کی لیجسلیٹو پارٹی نے بخشی صاحب کی کابینہ کے ایک نوجوان وزیر کو اپنا لیڈر منتخب کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انتخاب کے ذمے دار خود بخشی صاحب ہی تھے، جو صادق صاحب کا برسر اقتدار آنا اپنے مصالح کے منافی سمجھ رہے تھے۔ بہر کیف اس انتخاب نے بخشی صاحب کے لئے مزید پیچیدگیاں اور شمس الدین کے لئے دشواریاں پیدا کیں۔

" بالآخر بخشی صاحب کو "خود شمس الدین کے الفاظ میں" اپنی مشکلات سے نجات حاصل کرنے کی یہی صورت نظر آنے لگی

کہ اگر میں وزارت عظمیٰ سے دست بردار ہوجاؤں تو شاید ان کی اور ان کے دوست احباب کی تمام الجھنیں دور ہوجائیں[۵۱]۔"

چناں چہ اواخر فروری ۱۹۶۴ء میں شمس الدین نے ریاست جموں وکشمیر کی وزارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کرکے کشمیر کی تاریخ کے اس باب کو ختم کیا، جس کا ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی برطرفی و گرفتاری سے آغاز ہوا تھا۔ ان کی جگہ غلام محمد صادق نے ریاست کی وزارت عظمیٰ کا قلم دان سنبھالا۔

شیخ عبداللہ کی رہائی

صادق صاحب کی نئی حکومت نے برسر اقتدار آنے کے چار ہفتے بعد شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو رہا کردیا۔ اس دلیرانہ اقدام کا محرک یقیناً صادق صاحب کا جمہوری ذہن رہا ہوگا، جو شیخ عبداللہ کی مسلسل نظربندی نیز اُن بے بنیاد مقدمات کو جو ان پر چلائے جارہے تھے، جمہوری تقاضوں کے منافی سمجھ رہا تھا۔ یہ قدم اٹھانا انھوں نے یوں بھی ضروری سمجھا ہوگا کہ گزشتہ دس برسوں سے ریاست میں جبر و تشدد، دہشت انگیزی اور شہری حقوق کی پامالی کی جو فضا رہی تھی، اسے بدلنے اور جمہوری قدروں کو بحال کرنے کی کوشش میں شیخ عبداللہ کی رہائی سب سے زیادہ ممد و معاون ہوسکتی تھی۔ صادق صاحب کے اس فیصلے کی پشت پر جواہر لال نہرو کا یہ احساس بھی یقیناً کارفرما تھا کہ کشمیر کی گتھی کو سلجھانے اور ۱۹۵۳ء کی غلطی کی تلافی کے لئے شیخ عبداللہ کو رہا کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ شیخ عبداللہ کو رہا کرنے کا

---

[۵۱] ہفتہ وار آئنہ (سری نگر)، سال نامہ ۱۹۶۶ء، ص ۱۵

فیصلہ ریاستی سرکار نے حکومت ہند کے، مشورہ ہی سے کیا تھا۔[1]

شیخ نہرو ملاقات

شیخ عبداللہ کی رہائی کے فوراً بعد جواہر لال نہرو نے انھیں دہلی آنے کی دعوت دی۔ یہ وہ بات تھی جو بخشی صاحب کے دور میں ممکن نہیں ہو سکی تھی۔[2] اپریل ۱۹۶۴ء کے آخری ہفتے میں شیخ عبداللہ دہلی آئے اور جواہر لال نہرو نے انھیں اپنا مہمان بنایا۔ دہلی میں شیخ عبداللہ کا سرکاری طور پر جس طرح استقبال کیا گیا اور جو ان کی آؤ بھگت ہوئی، اس کا مقصد گزشتہ واقعات کی تلافی اور ہندستان و کشمیر کے تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز کرنا تھا۔

یہ باتیں جواہر لال نہرو کی حکومت کے بعض ساتھیوں کو پسند نہ آئیں بلکہ کشمیر اور شیخ عبداللہ کے بارے میں جواہر لال نہرو کا جو نظریہ تھا اس سے بھی انھیں بنیادی اختلاف تھا۔ اس سلسلے میں گلزاری لال نندا کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جو اُن دونوں ہمارے ہوم منسٹر تھے۔ جواہر لال نہرو اگرچہ اس وقت مفلوج ہو چکے تھے اور ان کی زندگی مہینوں کی نہیں، ہفتوں کی نہیں بلکہ صرف دنوں کی مہمان تھی، لیکن وہ پھر بھی اتنی طاقت رکھتے تھے کہ ان کے سامنے کسی کی چل نہیں سکتی تھی۔ شیخ عبداللہ کے سلسلے میں بھی یہی ہوا۔ انھوں نے جو کچھ مناسب سمجھا وہ کر گزرے اور ان کے اقدام کے خلاف لب کشائی کی کسی کو ہمت نہ ہو سکی۔

---

[1] دیکھئے کارروائی لوک سبھا یکم اپریل ۱۹۶۴: کالم ۸۵۸۱

[2] ایضاً ایضاً کالم ۸۵۸۷

شیخ عبداللہ کا بیان

دہلی سے واپسی کے وقت شیخ عبداللہ نے ایک طویل بیان جاری کیا جس میں انھوں نے کشمیر کے مسئلے کے ساتھ ساتھ ہندستان و پاکستان کے تعلقات کی استواری پر بھی زور دیا تھا۔ اس بیان میں انھوں نے کہا تھا:

"وزیر اعظم نہرو کی پرخلوص دعوت پر میں دہلی آیا اور مجھے ان سے، ان کی کابینہ کے رفقا سے، پارلیمنٹ کے متعدد ممبروں اور مختلف زاویہ نگاہ کے لیڈروں سے، جن میں آچاریہ ونوبا بھاوے، مسٹر راج گوپال آچاریہ، مسٹر جے پرکاش نراین اور دوسرے ممتاز لیڈر بھی شامل ہیں، میں نے صلاح و مشورہ کیا۔ صدر اور نائب صدر [جمہوریہ] سے بھی تبادلۂ خیال کا مجھے موقع ملا۔

"اس سیر حاصل تبادلۂ خیالات کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ ہر شخص اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہے کہ ہندستان و پاکستان کے درمیان پائیدار دوستانہ تعلقات قایم ہوں۔ یہ بھی عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ مسئلۂ کشمیر کے دائمی حل کو دونوں ملکوں کی حمایت حاصل ہونا ضروری ہے۔ میں نے لوگوں میں اس کا بھی بڑھتا ہوا احساس پایا ہے کہ اس جھگڑے کے طے کرنے میں جو لامتناہی تاخیر ہو رہی ہے، وہ اس ریاست کے باشندوں کی سیاسی و اخلاقی ترقی میں مانع ہے، جس پر عدم استحکام اور عدم تحفظ کے گھرے بادلوں کا پیہم سایہ رہا ہے۔

" دونوں ملکوں کے تعلقات کی کشیدگی نے ایک مسلسل تناؤ پیدا کر رکھا ہے جو اکثر درندگی کا روپ دھار لیتا ہے اور بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے. چناں چہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں بدترین قسم کی دہشت زدگی کا شکار ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اچھے شہری کی زندگی گزارنے کی صحت مندانہ اہلیت کھوتی جا رہی ہیں۔

" ہندستان و پاکستان جس تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں، اس کی رفتار کو اگر روکا نہ گیا تو ایشیا میں اقتدار کا توازن درہم ہوگا اور پورا برصغیر تباہی کے شعلوں کی نذر ہو جائے گا۔

" ایک بھیانک صورت حال سے آج ہم دوچار ہیں، اور ہندستان و پاکستان کے تعلقات کی موجودہ خرابی کو اگر ہم نے بڑھنے دیا تو ہمارے آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہ کریں گی. تعلقات کی خرابی کی رفتار کو روکنا ہی دونوں ملکوں کے لیڈروں کا اہم ترین فرض نہیں ہے بلکہ ایسے ذرایع ڈھونڈھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی ان کے لئے ضروری ہے جن سے ہندستان و پاکستان کے درمیان دایمی میل جول اور دوستی پیدا ہو۔

" اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دینی ہیں، اور ان تمام موانع کو دور کرنا ہے جو دونوں ملکوں کو محارب کیمپوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں

مسلمہ طور پر کشمیر کا مسئلہ سترہ برسوں سے دونوں ملکوں کو مشتعل کرتا رہا ہے. چناں چہ ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ یہ اشتعال انگیز سبب دور ہو اور اس مسئلے کا کوئی دوستانہ حل نکل سکے۔

" یہ کہنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک ایسا حل ہونا چاہئے جس سے نہ تو کسی ملک کو شکست کا احساس ہو، نہ ہندستان کی سکولر بنیادیں ہی اس سے کمزور ہوں نیز جس سے ریاست کے عوام کی آرزوؤں کی بھی تکمیل ہو سکے اور انھیں باعزت مقام مل سکے۔ ایسا معقول حل ڈھونڈھ لینا، جو ان تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے، جن کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، عین ممکن اور ممکن الحصول ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ ان سب لوگوں کا بھی، جن سے میں نے تبادلۂ خیال کیا، یہی خیال ہے۔ اس سلسلے میں قطعی نتائج تک پہنچنے میں قدرتی طور پر کچھ وقت لگے گا خصوصاً اس حالت میں جب کہ پاکستان کے لیڈروں سے ابھی گفتگو اور صلاح و مشورہ نہیں کیا جا سکا ہے۔

" ہم لوگ فی الحال بعض فارمولوں پر غور کر رہے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی کسی ممکن العمل حل کا معقول ڈھانچہ تیار ہو جائے گا۔ دریں اثنا میں اخبارات سے اپیل کرتا ہوں کہ دوستی کی فضا اور مفاہمت کا ماحول پیدا کرنے میں وہ ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ مجھے توقع ہے کہ اخبارات قیاس آرائیاں بھی نہ کریں گے جن سے ہماری کوششیں مجروح ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی میں پاکستان جا کر پریسیڈنٹ ایوب خاں

اور وہاں کے دوسرے لیڈروں سے بھی میں بات چیت
کرسکوں گا۔[۱]"

شیخ عبداللہ کے متعلق جواہر لال نہرو کا
آخری اظہارِ خیال

شیخ عبداللہ کا مندرجہ بالا بیان دراصل جواہر لال نہرو کے دل کی آواز تھی، اس لئے قدرتی طور پر انھوں نے شیخ عبداللہ کے خیالات کی تائید اور ان کی کوششوں کی علانیہ حمایت کی۔ اپنی وفات سے چند ہی روز قبل آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس (بمبئی) میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"شیخ عبداللہ سکولرازم کے اصولوں پر پختہ یقین رکھتے ہیں، اور کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے ان اصولوں کو کسی نوع کا بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ وہ اس دو قومی نظریے کو بھی نہیں مانتے ہیں جو قیامِ پاکستان کی اساس ہے۔ تاہم ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندستان کے لئے، اپنے اصولوں پر قایم رہتے ہوئے بھی، پاکستان کے ساتھ امن و آشتی کی زندگی گزارنا ناممکن نہ ہونا چاہئے، اور اس طرح کشمیر کی گتھی بھی سلجھ سکتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی کوششوں میں ہم کامیاب ہی ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس مقصد



میں کام یابی نہ ہو ہندستان کو پاکستان کے ساتھ مسلسل تصادم کے بوجھ کو، اور ان تمام نتائج کو جو اس میں مضمر ہیں، برداشت کرتے رہنا ہو گا۔ مجھے توقع ہے کہ ہندستان سے ہراسان ہونے اور اس سے نفرت کرنے کے جذبے سے بھی پاکستان کو نجات حاصل ہو سکے گی۔ مجھے اس کی بھی امید ہے کہ دونوں ملکوں کے لئے ایک دوسرے سے قریبی اور دوستانہ تعلقات پیدا کرنا بھی ممکن ہو سکے گا، اور اسی میں دونوں کی بھلائی ہے۔

"شیخ عبداللہ اگر یہ کر سکے تو وہ دونوں ملکوں کی عظیم خدمت انجام دے سکیں گے۔ اس مقصد کے حصول کی کوشش میں، ہم ان کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے تیار ہیں...[۵]"

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ یہی تقریر آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں جواہر لال نہرو کی آخری تقریر تھی۔ ان کی یہ آواز فضاؤں میں گونج ہی رہی تھی کہ ہندستان کا یہ سب سے بڑا سپوت، جواہر لال نہرو، اس دنیا سے چل بسا — اور ایک ایسے وقت میں چل بسا جب کہ اس برصغیر کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جواہر لال نہرو اگرچہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، لیکن ان کی وفات، عام حالات میں بھی، ہندستان کی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہوتی، لیکن کشمیر کی گتھی کو سلجھانے اور ہندستان و پاکستان کے تعلقات کو دوستی کی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے جو دلیرانہ قدم انھوں نے اٹھایا تھا، اس کے پیش نظر، ان کی اچانک موت ہماری تاریخ کا عظیم ترین سانحہ ثابت ہوئی۔ شیخ عبداللہ

۵۔ کانگرس بلیٹن (انگریزی): مارچ تا جون ۱۹۶۴ء

نے یہ خبر مظفر آباد (مقبوضہ کشمیر) میں سنی اور اپنے دورے کو ادھورا چھوڑ کر انھوں نے ہندستان کا رخ کیا۔ پاکستان کی حکومت نے بھی ان کی واپسی کے سلسلے میں ہر ممکن امداد دی۔

پانسہ پلٹ گیا

جواہر لال نہرو کی بے وقت وفات کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ ان قوتوں کو پوری شدت سے ابھرنے کا موقع مل گیا جو کشمیر اور پاکستان کے سلسلے میں ان کی پالیسی سے متفق نہیں تھیں، لیکن ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ جواہر لال نہرو کے جانشین، لال بہادر شاستری، جواہر لال نہرو کی ہر پالیسی کی پیروی اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل کو اگرچہ اپنا فرض جانتے تھے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی وزارت عظمیٰ کو خطرے میں ڈالنا وہ شاید مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی اس روش میں ذاتی نہیں — بلکہ ملکی مفاد مدِنظر تھا۔

جواہر لال نہرو کی کابینہ میں گل زاری لال نندا وزیرِ داخلہ تھے، اور لال بہادر شاستری کی حکومت میں بھی یہی عہدہ ان کے تصرف میں رہا۔ لیکن جواہر لال نہرو کے زمانے میں گل زاری نندا کو اپنے محکمے کے ہر فیصلے کے لئے جواہر لال نہرو کی منظوری کی ضرورت ہوتی تھی۔ نئے حالات نے یہ بساط بالکل الٹ دی۔ اب وزیر اعظم لال بہادر شاستری بھی کابینہ میں اپنے فیصلوں کی منظوری کے لئے گل زاری لال نندا کی حمایت اور ان کے تعاون کے محتاج تھے، اور اس کی انھوں نے پوری پوری قیمت بھی وصول کی چنانچہ حکومت کی بنیادی پالیسیوں میں، جن میں کشمیر کا مسئلہ بھی شامل تھا، گل زاری لال نندا کے خیالات و رجحانات کی چھاپ لگ گئی۔

حالات کی اسی روش نے کشمیر کے بارے میں حکومت ہند کے سوچنے کا ڈھنگ یک سر بدل دیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کشمیر و ہندستان کے تعلقات کے جس نئے باب کا آغاز کیا تھا، وہ ادھورا ہی نہیں رہا، بلکہ اسے حرفِ غلط کی طرح فراموش بھی کر دیا گیا۔

جواہر لال نہروؔ کے بعد

جواہر لال نہرو کے آخری مراسم کی ادائیگی کے بعد شیخ عبداللہ سری نگر واپس گئے۔ نئے وزیر اعظم کے انتخاب اور نئی حکومت کی تشکیل کی دہلی میں چند روز تک گہما گہمی رہی۔

یاس و نا اُمیدی

گمان ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ نئی حکومت کی تشکیل کے مراحل ختم ہونے کے بعد حالات جب اعتدال پر آجائیں گے تو نئے وزیر اعظم لال بہادر شاستری شیخ عبداللہ سے گفت و شنید کے ان تاروں کو پھر جوڑنے کی کوشش کریں گے جن کا شیرازہ جواہر لال نہرو کی اچانک موت سے درہم برہم ہو گیا تھا۔ لیکن ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گزرتے گئے مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ اس کے برعکس حالات کی روش ظاہر کر رہی تھی کہ جن سنگھ اور کانگرس کے داہنے بازو کی بھی یہی کوشش ہے کہ ہندستان کے دستور کی اس دفعہ کو، جو کشمیر کی مخصوص حیثیت کی ضامن ہے، دستور سے خارج کر دیا جائے۔

"میں اس سے متفق ہوں کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کو قومی زندگی کے دھاروں میں ضرور ملا دینا چاہئے... لیکن اس وقت ہم خود دفعہ ۳۷۰ کو اگر کالعدم قرار دیتے ہیں، تو یہ قدم اٹھانے سے پہلے اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر بھی ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا... مجھے اس میں شک ہے کہ یہ ایوان ایسا کرنے کا بھی مجاز ہے..."

کھڈل کر

کارروائی لوک سبھا: ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء

دفعہ ۳۷۰ پر یورش

جواہر لال کی وفات کو ابھی ساڑھے تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ ۱۱ستمبر کو لوک سبھا میں ایک غیر سرکاری بل پیش کیا گیا، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ:

"بھارتیہ سنودھان کی دھارا ۳۷۰ ہٹا دی جائے[1]"

یہ بل لوک سبھا کے ایک آزاد ممبر ویر پرکاش شاستری نے پیش کیا تھا۔ اس بل پر جو تقریریں کی گئیں اس نے یہ بات واضح کردی کہ اسے پورے ایوان کی حمایت وتائید حاصل ہے۔ ایچ۔ ڈی۔ کامتھ نے حکومت کو یاد دلایا کہ شیخ عبداللہ کی رہائی سے چند روز قبل، ان کی رہائی کا معاملہ جب اس ایوان کے سامنے آیا تھا، تو شری گل زاری نندا نے، جو اس وقت بھی وزیر داخلہ تھے، اور لال بہادر شاستری نے، جو اس وقت وزیر بے محکمہ تھے،

"دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ایوان کو یقین دلایا تھا کہ یہ دفعہ [۳۷۰] جلد ہی اگر منسوخ نہ بھی کی گئی تو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ آپ اپنی موت مرجائے گی"

اسی وعدے کے پیش نظر انھوں نے مطالبہ کیا کہ اس دفعہ کو دستور سے حذف کرنے کا وقت اس لئے آگیا ہے کہ:

"کابینہ یا کانگرس پارٹی میں، اس پارلی منٹ میں یا پورے ملک میں اس دفعہ کو قلم زد یا حذف کرنے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا[2]"

---

[1] کارروائی لوک سبھا، ۱۱ستمبر ۱۹۶۴: کالم ۱۲۷۸

[2] ایضاً ایضاً کالم ۱۳۰۳

ایک ذمہ دار کانگرسی ممبر ہنومنتیا نے کہا:

"میں وزیر داخلہ سے اپیل کروں گا کہ اس مسئلے کو وہ جمہوری نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ کشمیر ہی کے ممبران پارلی منٹ کا نہیں، بلکہ ہم جملہ ممبران کا، بلا لحاظ پارٹی — انتہا پسند دائیں بازو سے لے کر انتہا پسند بائیں بازو تک کا — خیال ہے کہ [دفعہ ۳۷۰ کے حذف کرنے کے] اس بل کو قانون میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کی مخالفت کرنا یا اس کے خلاف کچھ کہنا دستور سے انکار کرنے کے مرادف ہے[1]"

ان سب تقریروں کو سننے کے بعد ان۔ سی۔ چٹرجی نے حیرانی کے ساتھ کہا:

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ گورنمنٹ کو فوری طور پر یہ اعلان کر دینے میں کیا قباحت محسوس ہو رہی ہے کہ — 'اس مطالبے کی ہم مکمل طور پر حمایت کرتے ہیں' کیوں کہ یہ فرقہ وارانہ مطالبہ نہیں، کسی ایک ایسی پارٹی کا مطالبہ نہیں، بلکہ یہ ایک قومی مطالبہ ہے[2]"

نقار خانے میں طوطی کی آواز

ویر پرکاش شاستری کے اس بل کے سلسلے میں جتنی بھی تقریریں ہوئیں ان میں جملہ مقرروں نے — "بلا لحاظ پارٹی، انتہا پسند دائیں بازو سے

---

[1] ایضاً ایضاً: کالم ۱۳۱۹

[2] ایضاً ۲۰نومبر ۱۹۶۴: کالم ۷۸۹

لے کر انتہا پسند بائیں بازو تک" کے ممبروں نے دفعہ ۳۷۰ کو حذف کر دینے کی تائید کی[1] صرف کھڈل کر ہی ایک ایسے مقرر تھے، جنھوں نے ہمارے دستور کی اس روح کی طرف موثر اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھا کہ دفعہ ۳۷۰ کو قلم زد کرنے کا پارلیمنٹ کو نہیں بلکہ صرف کشمیری عوام ہی کو اختیار حاصل ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ:

"میں اس سے تو متفق ہوں کہ کشمیر اور اہل کشمیر کو قومی زندگی کے دھاروں میں ضرور ملا دینا چاہیے، اور اب دستوری یا کسی اور دیوار کے [کشمیر اور ہندستان کے درمیان] حایل ہونے کی ضرورت نہیں ہے ـــــ لیکن اس وقت، ہم خود ہی دفعہ ۳۷۰ کو اگر کالعدم قرار دیتے ہیں تو یہ قدم اٹھانے سے پہلے اس فیصلے کے مختلف پہلوؤں پر بھی ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا... مجھے اس میں شک ہے کہ یہ ایوان ایسا کرنے کا مجاز بھی ہے... مجھے دستوری نگاہ سے اس میں شبہ ہے کہ یہ ایوان ایسا قدم اٹھا بھی سکتا ہے... [دفعہ ۳۷۰ کو حذف کرنے کی] تحریک کشمیری عوام کی طرف سے ہونی چاہیے[2]۔"

کھڈل کر کی یہ آواز اگرچہ نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہ تھی، اور اس کے خلاف ایوان میں احتجاجی شور و غل بھی ہوا، مگر اس نے دستور کی خوابیدہ روح کو بیدار بھی کر دیا، جس نے اس بل کے قانون میں تبدیل

---

[1] Sisir Gupta : *Kashmir*

[2] کارروائی لوک سبھا، ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء: کالم ۱۹-۳۱۸

ہونے کی راہیں روک لیں۔

شیخ عبداللہ کی ذہنی کیفیت

"شیخ صاحب کے ذہنی پیچ و تاب کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے ہیں" ایک نوجوان کشمیری وکیل نے مجھ سے کہا "انھیں تو توقع یہ تھی کہ لال بہادر شاستری گفت و شنید کا سلسلہ اسی جگہ سے شروع کریں گے، جس جگہ سے جواہر لال نہرو کی وفات نے منقطع کیا تھا، کیوں کہ جواہر لال کی کابینہ کے ساتھیوں میں شاستری جی ہی ایک ایسے آدمی تھے جو جواہر لال نہرو کے ذہن سے کلّی طور پر واقف تھے اور جن سے یہ بھی توقع تھی کہ جواہر لال کی ہر پالیسی کو، جس میں کشمیر کا مسئلہ بھی شامل ہے، وہ اپنے لئے پتھر کی لکیر سمجھیں گے۔ لیکن جلد ہی شیخ صاحب نے محسوس کر لیا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ کو حذف کرنے کا جو غیر سرکاری بل لوک سبھا میں پیش ہوا، اور بلا استثنا اس کی جو عام حمایت ہوئی، جس میں کانگرسی ممبر پیش پیش رہے، اس نے شیخ صاحب کو یقین دلا دیا کہ اب گاڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔ ہندستان کی پارلیمانی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا موقع آیا ہو جب کہ کانگرس اور جن سنگھ اور ایوان کی دوسری تمام پارٹیاں اس طرح کسی مسئلے پر متفق ہوئی ہوں۔

"اس احساس کے ساتھ ہی شیخ صاحب کو اس کا بھی علم ہوا کہ صادق حکومت پر، جس کی عمر ابھی سات آٹھ مہینوں ہی کی تھی، مرکز زور ڈال رہا ہے کہ دستور ہند کی پیدا کردہ رکاوٹ کو

دور کرنے کے لئے ریاستی قانون ساز اسمبلی میدان میں آئے اور دفعہ ۳۷۰ کو دستور سے خارج کرنے کا مطالبہ کرے۔ اس نے صادق صاحب کو شدید الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ شیخ صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ صادق صاحب بھی اس کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہو سکتے کیوں کہ کشمیریوں کے احساسات و جذبات کا انھیں بھی اتنا ہی علم تھا جتنا کہ شیخ صاحب کو یا کسی اور کشمیری کو ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اس حقیقت سے بھی شیخ صاحب باخبر تھے کہ صادق حکومت کا سارا انحصار مرکز ہی پر ہے، جس نے ابھی بخشی غلام محمد کو یک سر قلم زد نہیں کیا تھا، اور کسی وقت بھی انھیں واپس لانے کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ یہ اسی خدشے کا نتیجہ تھا کہ صادق حکومت نے مرکز سے شاید یہ سمجھوتہ کر لیا کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۷۰ تو دائم و قائم رہے لیکن ایک ایک کر کے دستور کی تمام دفعات ریاست جموں و کشمیر میں بھی نافذ کی جائیں۔ صادق صاحب کے پاس سوا اس کے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

" آپ کو یاد ہوگا کہ صادق حکومت نے ستمبر ۱۹۶۴ء کے تیسرے ہفتے میں جب بخشی غلام محمد کو گرفتار کیا تو مرکزی حکومت نے اس اقدام کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا، بلکہ صادق صاحب کو غالباً مرکز ہی کے زور ڈالنے سے، چند مہینوں کے بعد، خرابی صحت کی آڑ لے کر انھیں رہا بھی کرنا پڑا۔ رہائی کے بعد بخشی غلام محمد جب دہلی گئے تو، صادق حکومت پر بخشی غلام محمد کی اہمیت واضح کرنے ہی کے لئے، حکومت ہند کے وزیر و امیر ___ نائب صدر جمہوریہ، وزیر اعظم اور دوسرے وزرا، ان کی عیادت اور مزاج پرسی کے لئے اس طرح گئے

جیسے اس وقت بھی وہ ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم ہی ہوں۔

" بخشی صاحب کی رہائی اور ان کے دہلی جانے سے چند ہی ہفتہ قبل حکومت ہند کی اہم ترین وزارت — وزارت داخلہ کے وزیر باتدبیر گل زاری نندہ نے اعلان کیا تھا کہ دستور ہند کی دفعہ ۳۵۶ و دفعہ ۳۵۷ کا ریاست جموں و کشمیر پر بھی نفاذ عمل میں آئے گا، جن کی رو سے صدر جمہوریہ کو ملک کے اور حصوں کی طرح ریاست جموں و کشمیر میں بھی ایمرجنسی کا اور صدر راج کے نفاذ کا اعلان کرنے کا اختیار ہوگا۔"

ترک موالات

" حکومت ہند کے اس اقدام نے شیخ صاحب کی مایوسی کو غم و غصہ کا رنگ دے دیا" ایک دوسرے نوجوان وکیل نے اپنے رفیق کے تجزئے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "شیخ صاحب کو اس کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ حکومت ہند کا یہ اقدام ریاست کی کانگرسی حکومت کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۵ء کو محاذ کے ایک جلسے میں حکومت ہند کے خلاف احتجاجی تجویز پاس کی گئی اور ۹ جنوری کو اسی سلسلے میں ایک ایکشن کمیٹی بنائی گئی۔ اس وقت شیخ صاحب کی جو ذہنی کیفیت تھی اس نے انھیں ایک انتہا پسندانہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ان کا یہ اقدام حکومت ہند یا ریاستی حکومت سے کہیں زیادہ ریاستی کانگرس کے خلاف تھا۔ جمعہ کے دن حضرت بل میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کانگرسیوں سے ترک موالات کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک خاموش مگر شدید احتجاج تھا، جو شاید بلا سوچے

سمجھے کیا گیا تھا۔ اب میرا خیال ہے کہ یہ قدم نہ اٹھایا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔ بہرکیف شیخ صاحب کے اعلان کے مطابق ترک موالات کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں یہ بھی ایک قیامت ہوئی کہ نہ تو ترک موالات کے حدود کا تعین کیا گیا اور نہ اس کی تشریح ہی کی گئی۔ لیکن کشمیری عوام نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس پر عمل درآمد کیا، اور پوری شدت سے کیا، کیوں کہ شیخ صاحب نے اسے ان کا امتحان قرار دیا تھا۔

"ترک موالات کی اس تحریک نے" اسی نوجوان وکیل نے مجھے بتایا "کشمیر میں عموماً اور سری نگر میں خصوصاً جو صورت حال پیدا کر دی تھی اس کا اندازہ لگانا آپ کے لئے ممکن نہیں ہے۔ کانگرسی، جو تعداد میں زیادہ نہیں تھے، ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ بھائی نے بھائی سے اور اکثر گھرانوں میں بیویوں نے اپنے شوہروں سے بولنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لوگوں نے کانگرسیوں سے بول چال ہی نہیں بلکہ موت و زندگی بھی ترک کر لی تھی۔ کانگرسی گھرانے کے لوگوں کو جنازہ اٹھانے والے بھی نہ ملتے تھے۔ میرے محلے میں ایک کانگرسی کے گھر میں موت ہوئی۔ محلے کی مسجد سے جنازہ لے جانے والا تابوت وہ اٹھا لایا۔ بعد میں لوگوں نے اس تابوت کو جلا دیا —— ان کے خیال میں چوں کہ ایک کانگرسی مردہ اس میں رکھا گیا تھا، اس لئے وہ ناپاک ہو گیا تھا۔"

"یہ تحریک ختم کیوں کر ہوئی؟" میں نے نوجوان دوست سے سوال کیا۔

"ابھی تحریک چل ہی رہی تھی" نوجوان نے جواب دیا "کہ شیخ صاحب عازم حج ہوئے۔ ان کے باہر جانے کے بعد قیادت جن لوگوں کے ہاتھ

میں آئی، وہ ابتدا ہی سے شاید اس تحریک کے حق میں نہیں تھے۔ عوام بھی زیادہ دنوں تک اسے چلا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ یہ تحریک آپ ہی اپنی موت مر گئی۔"

سفرِ حج

"شیخ صاحب کوئی پونے تین مہینے ملک سے باہر رہے" ایک واقف حال معمر کشمیری نے مجھ سے کہا۔ "پہلے وہ مصر گئے جہاں پہلے دن تو انھیں ہندستانی سفارت خانے نے ہاتھوں ہاتھ لیا، لیکن پھر نہ جانے کیوں ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ ہمارے پاکستانی کرم فرما اس خلا کو پر کرنے کے لئے جھپٹے، لیکن اس موقع پر صدر ناصر نے شیخ صاحب کو اپنا مہمان بنا کر پاکستان کے اقدام کو ناکام بنا دیا۔ صدر ناصر نے بروقت قدم اٹھا کر شیخ صاحب ہی کو ایک سخت مخمصے سے نجات نہیں دلائی بلکہ ہندستان کے ساتھ دوستی کا حق بھی ادا کیا۔ شیخ صاحب قاہرہ سے لندن اور الجیریا گئے۔ لندن میں بھی انھوں نے وہی باتیں دہرائیں جو سری نگر اور دہلی میں بھی کہتے رہے تھے۔ لیکن ہر موقع پر ان کا لہجہ مصالحت آمیز ہی رہا۔[1]

شیخ صاحب الجیریا پہنچے تو وہاں بھی حکومت ہند کے نمائندوں نے ان سے بے رخی برتی، جس کا پاکستانی نمائندوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وزیر اعظم چواین لائی بھی اس وقت وہیں موجود تھے۔ پاکستانی نمائندوں نے ان کی طرف سے شیخ صاحب کو ملاقات

---

[1] شیخ عبداللہ نے لندن کی پریس کانفرنس میں اپنے اس اعتماد کا بھی اظہار کیا تھا کہ "کشمیر کا معاملہ اگر لال بہادر شاستری ہی پر منحصر رہے، جو امن پسند انسان ہیں تو اسے طے کرنا وہ پسند کریں گے۔ ہمارا کام انھیں تقویت پہنچانا اور مصالحت کی فضا پیدا کرنا ہے۔" (اسٹیٹسمین (دہلی) ۱۹ مارچ ۱۹۶۵ء)

حرفِ آخر

کی دعوت دی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ شیخ صاحب اور ہندستان میں اختلافات کی خلیج اور بھی وسیع ہو۔ شیخ صاحب جیسے آزمودہ کار اور تجربہ کار انسان کا پاکستان کے ہاتھ میں اس طرح کھیل جانا حیرت ناک ہے۔ لیکن ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے۔ چوان لائی اور شیخ صاحب کی ملاقات، جو پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں تھی، کوئی ایسا ناقابلِ معافی جرم بھی نہیں تھا۔ آپ کو بھی شاید یاد ہو کہ عین اس زمانے میں جب کہ ہندستان و چین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھیں، تو ہندستان کے وزیر دفاع، شری کرشنا مینن نے بھی چوان لائی ہی سے یورپ کے کسی ملک میں ملاقات ہی نہیں کی تھی، بلکہ صبح کا ناشتہ بھی ان کے ساتھ کیا تھا۔

"الجیریا سے شیخ صاحب حج بیت اللہ کے لئے گئے۔ جہاں ان ہی دنوں موتمر اسلامی بھی ہو رہی تھی۔ کشمیری حاجی جو شیخ صاحب کے شریکِ حج تھے، ان کا بیان ہے کہ اس اسلامی عالمی کانفرنس میں شیخ صاحب نے پاکستان کے مقابلے میں ہندستان کے نقطۂ نگاہ کی تائید کی تھی۔ واپسی پر ان کی گرفتاری شاید اسی کا انعام تھا۔"

مندرجہ بالا بیان بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے۔ پاکستان نے ہندستان کو بدنام کرنے کے لئے جو تجویز پیش کی تھی، صرف اسی وجہ سے وہ منظور نہیں کی جا سکی کہ شیخ عبداللہ نے سب کمیٹی میں اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ عام اجلاس میں بھی ہندستانی نمائندہ کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے پاکستان کو یاد دلایا تھا کہ اقلیتوں کے مسئلے کا جہاں تک تعلق ہے، خود پاکستان کا دامن بھی کچھ کم داغ دار نہیں ہے!

این گناہے ست کہ در شہرِ شما نیز کنند

"ہندستان میں بعض ایسے رجحانات بھی سر اٹھارہے ہیں، جو مستقبل میں ہندستان کو ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں... ایسی حالت میں ہندستان کے ساتھ کشمیر کا مسلسل الحاق اس [فرقہ وارانہ] رجحان کو شکست دینے میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔"

شیخ عبداللہ

کارروائی کشمیر دستور ساز اسمبلی: ۵ نومبر ۱۹۵۱ء

"میں کشمیری مسلمان ہوں" ایک نوجوان نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا، جس سے نشاط باغ جاتے ہوئے، بالکل اتفاقی طور پر، بس میں ملاقات ہوئی تھی "کانگرس اور محاذ رائے شماری دونوں کی انتہا پسندی سے مجھے اختلاف ہے۔ کانگرس کے سامنے تو خیر ایک واضح راہ ہے بھی اور وہ ہندستان کے ساتھ کشمیر کا مکمل الحاق چاہتی ہے۔ لیکن محاذ والوں کو شاید خود بھی نہیں معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اس سے بھی زیادہ عجیب حقیقت ہے کہ کانگرس کے ساتھ بہت کم اور محاذ کے ساتھ بیش تر کشمیری ہیں۔"

صادق+عبداللہ

نشاط باغ کے ایک بوڑھے چنار کے نیچے بیٹھے ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک اور نوجوان کشمیری پنڈت بھی وہیں آبیٹھا، جو نوجوان مسلمان کشمیری کا دوست تھا۔ اس نے بھی ہماری گفتگو میں حصہ لیا۔

"ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے" نوجوان پنڈت نے کہا "ہندستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق میں اسی قدر ضروری سمجھتا ہوں، جس قدر ایک ہندستانی مسلمان کشمیر کا ہندستان کے ساتھ الحاق اپنے حق میں ضروری اور

مفید سمجھتا ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہاں کی نوے فی صدی آبادی اس کے حق میں نہیں ہے۔"

"اس مسئلے کا آخر حل کیا ہے؟" میں نے سوال کیا

"اس سوال کا براہ راست جواب تو کسی کے پاس نہیں ہے" کشمیری پنڈت نے جواب دیا "شیخ عبداللہ اور صادق صاحب بھی دو اور دو چار کی طرح اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ ہاں صادق عبداللہ کا ایک فارمولہ بن سکتا ہے شیخ عبداللہ اس وقت بھی کشمیریوں کے، یا کم از کم کشمیری مسلمانوں کے مسلّمہ لیڈر ہیں۔ کشمیر میں صادق صاحب کی ایک ایسی ذات ہے، جن کی قیادت پر تو نہیں، لیکن ان کی ایمان داری اور ان کے خلوص پر کشمیریوں کو عموماً اور کشمیری مسلمانوں کو خصوصاً شک و شبہ نہیں ہے۔ میرا گمان ہے کہ ان ہی دونوں کی متفقہ کوششوں سے کشمیر کی گتھی سلجھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں کو کسی جگہ بند کر دیا جائے اور جب تک کسی متفقہ فیصلے پر وہ نہ پہنچیں انھیں باہر نہ آنے دیا جائے"

"اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں" کشمیری مسلمان نوجوان نے کہا "تو میں آپ کو بتاؤں کہ اس کے کتنے حل ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ سنئے

"۱۔ ریاست جموں و کشمیر کو تو نہیں، لیکن وادی کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس خیال کو کشمیری مسلمانوں میں یقیناً مقبولیت حاصل ہے۔ لیکن یہ ممکن العمل حل نہیں ہے۔ شاید آپ اس کو نہ مانیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندستان

بھی اس حل کو اگر قبول کر لے، تو شیخ عبداللہ اور مولوی مسعودی ہی نہیں بلکہ افضل بیگ بھی وادی کو پاکستان کے حوالے کرنے پر شاید راضی نہ ہوں گے۔

"۲۔ ریاست جموں و کشمیر کو مکمل طور پر ہندستان میں ضم کر دیا جائے۔ اس کی تائید و حمایت کشمیری پنڈت اور جموں کے ہندو کریں گے۔ لیکن وادی میں، شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی تو ایک طرف رہے، صادق صاحب اور میر قاسم بھی کھل کر شاید اس کی حمایت نہ کر سکیں گے۔

"۳۔ ریاست جموں و کشمیر آزاد و خود مختار ہو۔ کشمیر کے سر پھرے مسلمان نوجوانوں کو آزاد کشمیر کا تصور یقیناً دل کش معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہندستان و پاکستان دونوں تیار نہ ہوں گے۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی بھی، جو خاصے آزمودہ کار لوگ ہیں، — شاید اس جال میں پھنسنا پسند نہ کریں گے۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جب کہ ایک طرف چین و ہندستان کے تعلقات اور دوسری طرف چین و روس کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہیں کہ چین کسی وقت بھی ہندستان یا روس کے ساتھ برسرِ جنگ ہو سکتا ہے، اور ان دونوں حالتوں میں پہلا خطرہ 'آزاد کشمیر' ہی کو ہو گا۔ ان حالات میں آزاد کشمیر میں یہ حل بھی خارج از بحث ہی ہے۔

"۴۔ ریاست جموں وکشمیر میں رائے شماری ہو۔ یہ وادی کا بڑا مقبول نعرہ ہے، جو محاذِ رائے شماری کی دین ہے۔ لیکن محاذ کے صدر مرزا افضل بیگ سے زیادہ کوئی دوسرا اس حقیقت سے واقف نہیں ہے کہ یہ ناممکن العمل ہے، اور نجی گفتگو میں وہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ رائے شماری کی پہلی شرط، اقوام متحدہ کی تجویز کے مطابق یہ ہے کہ پاکستان کشمیر کے اس حصے کو مکمل طور پر خالی کرے، جو آج اس کے قبضے میں ہے، اور پاکستان کسی قیمت پر بھی اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

"۵۔ آخری، اور شاید ممکن العمل بھی، حل یہ ہے کہ شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو کے مابین جو معاہدہ ۱۹۵۲ء میں ہوا تھا، اور جو عام طور پر دہلی معاہدے کے نام سے مشہور ہے، اس کی تجدید ہو اور اس پر لفظی و معنوی طور پر، عمل درآمد ہو۔ کشمیری رائے عامہ اس حل کو بھی آسانی سے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگی، لیکن شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی اگر اس حل کو قبول کر لیں، تو کشمیری رائے عامہ کو بھی وہ ہموار کر سکیں گے۔"

فرقہ وارانہ فسادات کا کشمیری ذہن پر اثر

ایک کشمیری نوجوان وکیل نے، جس کی گفتگو گزشتہ باب میں درج

کی جا چکی ہے، مجھ سے سوال کیا:

"ہندستان میں یہ فرقہ وارانہ فسادات کب تک ہوتے رہیں گے؟"[1] میرے جواب دینے سے قبل خود اسی نے اضافہ کیا کہ "آپ کو معلوم ہے کہ اس کا اثر کشمیر پر کیا ہوتا ہے؟ آپ کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہندستانی دستور کی دفعات کے نفاذ کے ساتھ فرقہ وارانہ فساد کی دبا وادئ کشمیر میں بھی نہ پھیلے گی؟ قراین تو یہی کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کے جراثیم کی درآمد بھی، ہندستانی قوانین کے جلو میں، شروع ہو گئی ہے۔

"گزشتہ بیس برسوں میں کم و بیش ایک درجن تو ایسی شادیاں یہاں ہوئی ہیں، جن میں مسلمان نوجوانوں نے ہندو لڑکیوں سے اور ہندو نوجوانوں نے مسلمان لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ان شادیوں پر لوگ جتنا بھی کڑھے ہوں، لیکن ایسی کسی شادی کو آڑ بنا کر کسی فرقے نے بھی کوئی تحریک شروع نہیں کی۔ لیکن گزشتہ مہینے ایک ہندو لڑکی نے ایک مسلمان کے ساتھ شادی کر لی تو اسے بہانہ بنا کر ہندوؤں نے سری نگر کی شہری زندگی میں جو ہیجانی کیفیت پیدا کی ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے، اور اس میں وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جانے کے پورے جراثیم موجود ہیں۔ اسے ہم اگر ابتدا سمجھیں تو اس کی جو انتہا ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

---

[1] یہ گفتگو ۱۲ راگست ۱۹۶۷ء کی ہے۔ اس وقت تک رانچی کا فساد نہیں ہوا تھا، اور سری نگر کی صورت حال نے فرقہ وارانہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔

"اور اس کو بھی جانے دیجئے" کشمیری نوجوان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے ایک اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا "حالیہ عام انتخابات میں جن سنگھ کا اتنی اکثریت سے شمالی ہند میں کامیاب ہونا، کم از کم کشمیر و ہندستان کے تعلقات کے لئے، کوئی شگونِ نیک نہیں ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ پانچویں عام انتخابات سے پہلے ہی اگر درمیانی مدت میں انتخابات ہوئے، جس کے قوی امکانات بھی ہیں تو شمالی ہند کی ریاستوں میں جن سنگھ ضرور برسر اقتدار آجائے گی، اور جن سنگھ کے جو نظریات ہیں خصوصاً کشمیر کے بارے میں، ان سے آپ تو مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔"

"آپ کے خدشات کو دور کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے" میں نے جواب دیا "اول تو میں آپ کے اس مفروضے سے متفق نہیں ہوں کہ درمیانی وقفے کے انتخابات اگر ہوئے تو شمالی ہند میں جن سنگھ برسر اقتدار آجائے گی، اور اگر ایسا ہو بھی تو جن سنگھ کی حکومت چل نہ سکے گی۔ آپ شاید اسے تسلیم نہ کر سکیں گے، لیکن میرا تو عقیدہ ہے کہ سکولرازم کے پودے نے ہندستان کی زمین میں جڑ پکڑ لی ہے، ممکن ہے کہ جن سنگھ کی بادِ سموم کے جھونکے وقتی طور پر اسے پژمردہ کر دیں، لیکن اس کی جڑیں مردہ نہیں ہو سکتیں۔ آج جو خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے، اور جس نے آپ کے ذہن کو بھی پریشان کر رکھا ہے، اس کا احساس شیخ عبداللہ کو آج سے پندرہ برس پہلے ہوا تھا۔ کل ہی میں ان کی وہ تقریر پڑھ رہا تھا، جو کشمیر کی دستور ساز اسمبلی میں، ہندستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے جواز میں انھوں نے کی تھی۔ اس خطرے کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں انھوں نے کہا تھا کہ انڈین یونین میں کشمیر کی موجودگی میں ایسا نہ ہو سکے گا۔[1] شیخ عبداللہ کے اس خیال میں یقیناً بڑا وزن ہے۔ انڈین یونین میں کشمیر کی موجودگی اس کی قطعی ضمانت ہے کہ کسی منزل میں بھی، پاکستان کی اسلامی ریاست کے جواب میں، ہندستان کو ہندو ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش اگر کی بھی گئی تو کشمیر کا وجود اس کی راہیں روک دے گا۔"

ہندستانی مسلمان اور کشمیر

اسی کشمیری وکیل نے ایک دوسری ملاقات میں میری اور میرے ہی جیسے ہندستانی مسلمانوں کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا:

"ایک بات میں آپ سے اور کہنا چاہتا ہوں، جسے عام طور پر کشمیری

---

[1] شیخ عبداللہ کی تقریر کا اقتباس یہ ہے:

"ہندستان میں بعض ایسے رجحانات بھی سر اٹھا رہے ہیں جو مستقبل میں ہندستان کو ایک مذہبی ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، جن سے مسلمانوں کے مفاد کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ یہ اسی حالت میں ممکن ہے جب فرقہ وارانہ جماعتوں کو حکومت میں بالادستی حاصل ہو جائے، اور کانگرس کے اس اصول کو کہ ملک کے تمام فرقوں کو برابری کے حقوق حاصل ہیں، مذہبی عدم رواداری کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے۔ ایسی حالت میں ہندستان کے ساتھ کشمیر کا مسلسل الحاق اس [فرقہ وارانہ] رجحان کو شکست دینے میں ممد و معاون ہوگا۔"

کارروائی کشمیر دستور ساز اسمبلی: ۵ نومبر ۱۹۵۱ء

اپنی زبان پر لاتے نہیں ہیں، لیکن ان کے دلوں میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے، خصوصاً آپ جیسے قوم پرست مسلمانوں سے، جو کشمیر کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں بلکہ اکثر کچھ نہ کچھ لکھتے بھی رہتے ہیں۔

"ایک دن آپ ہی نے کہا تھا کہ ہندستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق سے ہندستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو بھی طمانیت و تقویت رہے گی، کیوں کہ کشمیر کی حیثیت انڈین یونین کی ایک مسلم ریاست کی سی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیری مسلمان ہندستانی مسلمانوں کے لئے قربانی کیوں کریں؟ خصوصاً اس حالت میں جب کہ ہندستانی مسلمانوں نے ہمارے ـــــ اپنے کشمیری بھائیوں کے، احساسات و جذبات کو سمجھنے کی آج تک کوئی کوشش نہیں کی۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد، بخشی صاحب کے دس سالہ دور میں، کون سے مظالم ہیں، جو ہم پر توڑے نہیں گئے۔ لیکن ہمارے کسی مسلمان بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ہمارے ساتھ زبانی ہی ہم دردی کرے۔ دلی، کلکتہ لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں مسلمانوں کی نہ جانے کتنی کانفرنسیں ہوئیں، جن میں اسی اعلان پر اکتفا کی گئی کہ کشمیر ہندستان کا اٹوٹ انگ ہے، جس کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کا مفاد بھی وابستہ ہے۔ یہ کانفرنسیں بخشی صاحب ہی کے دور میں ہوئی تھیں، جنھوں نے کشمیری مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، لیکن کسی تجویز یا تقریر میں اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔"

"آپ کی یہ شکایت بالکل بجا ہے" میں نے اپنی اور اپنے ہی جیسے

دوسرے مسلمانوں کی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "لیکن اس سلسلے میں بعض حقایق کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اول تو بخشی صاحب کے دور تک ہندستانی مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے، ان کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی طرح کی کانفرنسیں کریں، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ پھر ان کانفرنسوں میں شریک ہونے والے حالات سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہم ہندستانی مسلمانوں نے، خصوصاً وہ قوم پرست مسلمان جن کی طرف آپ نے بھی خاص طور سے اشارہ کیا ہے، بخشی صاحب پر آنکھ بند کر کے ایمان لا چکے تھے۔ اس مرض میں ہم ہی نہیں بلکہ پورا ملک مبتلا تھا، اور پورا ہندستان کشمیر کو بخشی صاحب ہی کی عینک سے دیکھتا تھا۔ یہ بات میں نے عذر گناہ کے طور پر نہیں کہی ہے، بلکہ حقیقت یہی ہے۔"

"اچھا میں آپ کی یہ بات مانے لیتا ہوں" نوجوان نے کہا "لیکن بخشی صاحب کے بعد جب موئے مبارک کا اتنا بڑا سانحہ ہوا، جس نے پوری وادی کو ہلا کر رکھ دیا، اور جس میں حکومت ہند کی ہم دردیاں بھی ہمارے شامل حال تھیں، اس سلسلے میں بھی کسی ہندستانی مسلمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی[لہ]۔"

"موئے مقدس کی گم شدگی کے سلسلے میں مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ پورے ملک کی ہم دردیاں کشمیر کے ساتھ تھیں" میں نے جواب دیا



موئے مقدس ـــــ کشمیر کی اجتماعی زندگی کا ایک اہم نشان

"تمام اخبارات نے اس سلسلے میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا، اور پھر اس سانحے کے جلو میں مشرقی پاکستان میں اور پھر مشرقی ہندستان میں عظیم پیمانے پر جو فرقہ دارانہ فسادات ہوئے، ان کے سامنے یہ سانحہ بھی ماند پڑ گیا۔ چناں چہ موئے مقدس کی بازیابی پر مسرت کا جو منظاہرہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہو سکا۔"

"شاید آپ کو نہ معلوم ہو" کشمیری نوجوان نے کہا "کہ شیخ صاحب کو بھی ہندستانی مسلمانوں سے اسی قسم کی شکایت ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب عارضی طور پر وہ رہا ہوئے تھے تو اس وقت بھی ہندستانی مسلمانوں کی ایک کان فرنس ہوئی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا تھا۔ وہ تقریر میرے پاس محفوظ ہے، اور کل، میں آپ کو دوں گا۔ آپ اسے پڑھیے۔

"یہ باتیں میں نے آپ سے اس لئے کی ہیں" سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے نوجوان نے کہا "کہ میں آپ کی بہت سی باتوں سے متفق ہوں۔ میں بھی آپ ہی کی طرح کشمیری اور ہندستانی مسلمانوں کو قریب لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے آپ کے اس خیال سے بھی اتفاق ہے کہ جب تک کشمیر کے اور ہندستان کے باقی حصوں کے مسلمانوں کے مسایل کو تاش کے پتوں کی طرح پھینٹا نہ جائے گا، اس وقت تک دونوں کے مسایل حل نہیں ہو سکتے۔"

ہندستانی مسلمانوں سے شیخ عبداللہ کی شکایت

نوجوان کشمیری دوست نے حسب وعدہ شیخ عبداللہ کی تقریر دوسرے دن

لاکر مجھے دی۔ یہ تقریر ۷ر مارچ ۱۹۵۸ء کو خانقاہِ معلیٰ (سری نگر) میں کی گئی تھی اس کے آخری حصے میں انھوں نے مسلمان ممبرانِ پارلی منٹ و اسمبلی کی اس کانفرنس پر تبصرہ کیا تھا جو کشمیر ہی کے سلسلے میں مارچ ۱۹۵۸ء کے تیسرے ہفتے میں لکھنؤ میں ہونے والی تھی۔ اس تقریر کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

" ۱۹۵۳ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا، تو ہندستان کے بعض مسلمانوں نے بیان بازی کی تھی، اور نصیحتوں اور مشوروں سے مجھے نوازا تھا۔ پھر ان ہی مسلمانوں نے حکومت ہند کے سُر سے سُر ملا کر کہنا شروع کیا تھا کہ کشمیری تو اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اب پھر یہ خبر آئی ہے کہ ہندستان کی پارلی منٹ اور اسمبلیوں کے اکثر ممبروں کا کنوِنشن ۱۹، ۲۰ر مارچ ۱۹۵۸ء کو لکھنؤ میں بلایا جا رہا ہے ـــــ جس میں کشمیر کے مسئلے پر سوچ بچار کیا جائے گا، اور میرے حالیہ بیانات اور تقریریں بھی زیر بحث لائی جائیں گی....

"... میں نہایت ادب کے ساتھ... [مسلمان] ممبرانِ پارلی منٹ اور اسمبلی سے گزارش کروں گا کہ ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو جو ڈرامہ یہاں اسٹیج کیا گیا تھا، اور شیخ عبداللہ کو ایک سازش کے تحت غیر قانونی اور غیر پارلیمانی طریقے سے وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا کر اس کے ساتھیوں سمیت بند کر دیا گیا تھا، نیز یہاں کے مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا... کیا انھوں نے [مسلمان ممبرانِ

پارلی منٹ و اسمبلی نے] اس کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی تھی یا اس کی تحقیقات کیئے جانے کا بھی مطالبہ کیا تھا؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا، اور یقیناً نہیں کیا گیا، تو پھر آج اس کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے؟ گزشتہ پانچ برسوں میں یہاں کے مسلمانوں پر وہ کون سے مظالم ہیں، جو نہیں توڑے گئے، لیکن کبھی ان مسلمان ممبران [پارلی منٹ و اسمبلی] نے اس کی زحمت گوارا کی کہ یہاں آ کر بچشم خود حالات کا مشاہدہ کریں اور مظلوم مسلمانوں کی تالیف قلب کریں؟ حالاں کہ یہ ان کا فرض تھا مسلمان ہونے کے رشتے سے بھی، اور اسمبلی و پارلی منٹ کے ممبر ہونے کی حیثیت سے بھی کہ وہ کشمیر آتے اور مسلمانانِ جموں و کشمیر کے معاملات میں دلچسپی لیتے، مگر افسوس کہ کسی نے بھی ایسا نہ کیا...

" ۱۹۵۳ء کے سانحے پر تو کسی نے زبان تک نہ کھولی اور تحقیقات کا مطالبہ نہ کیا۔ شیخ عبداللہ پر امریکا سے ساز باز کرنے کا جب الزام لگایا گیا تھا تو اس وقت بھی وہ خاموش رہے اور انھوں نے اس کے متعلق حکومت ہند سے بالکل دریافت نہ کیا، حالانکہ انھیں علم تھا کہ یہ الزامات سراسر بے بنیاد اور جھوٹے ہیں۔ میں آج بھی اس کا یقین دلاتا ہوں کہ اگر کوئی الزام بھی میرے خلاف سچا ثابت ہو تو میں نہ صرف تمام ہندستانیوں سے معذرت خواہ ہوں گا، بلکہ جو بھی سزا میرے لئے تجویز کی جائے گی اسے بھگتنے کے لئے تیار رہوں گا"...

”قصہ زمیں، برسرِ زمیں، ہوا کرتا ہے۔ اگر ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی نیک نیتی سے یہ چاہتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو تو اس کے لئے لکھنؤ موزوں مقام نہیں۔ وہ قدرے جرأت سے کام لیں اور کشمیر تشریف لائیں، اور سری نگر آکر کشمیری عوام کے سامنے اپنی تجاویز پیش کریں۔ میں انھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنا کَن وِن شَن سری نگر میں بلائیں۔ گو ہم غریب اور مفلس ہیں مگر ان کی آؤ بھگت اور مہمان داری میں، جہاں تک ہو سکے گا کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے، ان سب کو سر آنکھوں پر ہم بٹھائیں گے۔ ان کے کَن وِن شَن میں شرکت کرکے ہم اپنا درد دکھ ان کو سنائیں گے اور اپنا موقف ان کے سامنے رکھیں گے۔ یہاں کے لوگوں کے حالات سننے کے بعد وہ کوئی نظریہ قایم کریں اور ہمیں مشورہ دیں۔ اس طریقے سے ہندستان کو بھی فایدہ پہنچے گا اور کشمیر کو بھی...“

شیخ عبداللہ کی تقریر کے مندرجہ بالا اقتباسات بہت سے حقایق کی غمازی کرتے ہیں ان کے اندازِ بیان میں طنز کے جو تیر و نشتر پنہاں، ان سے قطع نظر، ان کی تجویز آج کے حالات میں بھی سنجیدگی سے غور کئے جانے کا مطالبہ کرتی ہے۔

”کوئی اس طرح کی کانفرنس“ میں نے اپنے کشمیری دوست سے، آخری ملاقات میں سوال کیا ”جس میں کشمیری اور ہندستانی لیڈر شریک ہوں، آج بھی مفید ہو سکتی ہے؟“

”یقیناً مفید ہو سکتی ہے“ اس نے جواب دیا ”بہ شرطے کہ کشمیر سے صرف کانگرس یا نیشنل کانفرنس ہی کے نمایندوں کو نہیں بلکہ شیخ عبداللہ، مولوی مسعودی، محی الدین قرہ یا ان کے ساتھیوں کو بھی جو آزاد ہیں، شرکت

کی دعوت دی جائے۔ اگر یہ گروپ شریک نہ ہو سکا تو اس کی حیثیت بھی سابقہ کانفرنسوں سے مختلف نہ ہوگی“

شیخ عبداللہ بنام صدر ایوب

صدر ایوب نے اپنی خود نوشت[1] میں جو گذشتہ ماہ اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ہے، شیخ عبداللہ کی اس پاکستان یاترا کا بھی ذکر کیا ہے جس کی طرف پیش نظر کتاب میں بھی ضمناً اشارہ کیا گیا ہے۔ صدر ایوب نے شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کی ہیں، جو حقیقت سے دور ہیں، اور جن سے غلط فہمی پھیلنے اور جواہر لال نہرو کی نسبت بدگمانی پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اسی کے پیش نظر شیخ عبداللہ نے یکم ستمبر ۱۹۶۷ء کو ایک خط صدر ایوب کو لکھا۔ ۱۱ ستمبر کو انھوں نے حکومت ہند سے اس خط کی اشاعت کی خواہش کی۔ چند روز کے بعد اپنی خواہش کی یاد دہانی کرتے ہوئے انھوں نے حکومت کو توجہ دلائی کہ:۔

"صدر ایوب نے جو تاثرات قلمبند کئے ہیں وہ میرے ہی ساتھ نہیں، بلکہ مرحوم مسٹر نہرو کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں، اور یہ عام احساس ہے۔ کہ اب مجھے اس تصویر کا صحیح رخ پیش کرنا چاہئے۔"

شیخ عبداللہ کا یہ خط ۱۴ ستمبر کو شائع کر دیا گیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے!

---

[1] Friends Not Masters

[2] اسٹیٹسمین (دہلی)، مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۷ء

مائی ڈیر خان صاحب سلام علیکم

آپ نے اپنی کتاب "فرینڈس ناٹ ماسٹرس" میں کن فیڈریشن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"۱۹۶۴ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ جب پاکستان آئے تو ہندستان، پاکستان اور کشمیر کے کن فیڈریشن کی تجویز وہ بھی اپنے ساتھ لائے۔ میں نے ان سے صفائی سے کہا کہ اس تجویز سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ یہ عجیب بات ہے، عین اس وقت جب کہ ہم کشمیر کو نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے، ان حضرات کو ایک ایسی تجویز کی پیروی پر مجبور کیا گیا تھا جو اگر بروئے کار لائی جاتی تو ہماری غلامی کا بھی باعث بن جاتی۔ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ جو کچھ پنڈت نہرو نے ان کو سکھلایا تھا، وہی انھوں نے ہمارے سامنے دہرا دیا۔ میں انھیں الزام بھی نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ تو بالکل واضح ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ انھوں نے اپنی گفتگو سے یہ بات بہر کیف مجھ پر واضح کر دی کہ اُن کا مستقبل پاکستان ہی سے وابستہ ہے۔"

آپ کے مندرجہ بالا بیان میں چونکہ مجھے کچھ تناقص نظر آ رہا ہے، اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری اس گفتگو کو آپ اپنے ذہن میں تازہ کریں جو مرزا افضل بیگ کی معیت میں آپ سے میں نے کی تھی۔

کشمیر کے قضیے کی کوئی بندھی ٹکی تجویز ہم اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے کوئی بھی مخصوص تجویز آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمیں مجبور نہیں کیا تھا۔ یہ غلط ہے، ہم اس طرح کے لوگ نہیں ہیں۔

میرے پاکستان جانے اور آپ سے ملاقات کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ آپ کو

ہندستان کے وزیر اعظم کے ساتھ اعلا سطح کی ملاقات کے لئے آمادہ کروں، تاکہ کان فرنس کی میز کے گرد بیٹھ کر ایک ایسا حل ڈھونڈھا جاسکے جو سب متعلقہ لوگوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اس سوال کے جواب میں کہ میرے ذہن میں بھی کوئی خاص حل ہے، میں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ اقوامِ متحدہ کے پیدا کردہ اس حل کے علاوہ اور کوئی میرے ذہن میں نہیں ہے ___ جسے ہندستان اور پاکستان نے بھی قبول کر لیا تھا۔ میں نے ان متعدد حلوں کا بھی برسبیل تذکرہ ذکر کیا تھا جو اکثر احباب اور بعض دوست ملکوں نے وقتاً فوقتاً پیش کئے تھے۔ اسی ضمن میں ہندستان پاکستان اور کشمیر کے کن فڈریشن کا بھی میں نے نام لیا تھا، کیونکہ اور حلوں کے ساتھ یہ ایک حل بھی پیش کیا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آپ نے اس کی شدت سے مذمت کی تھی آپ کا خیال تھا کہ پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ہندستان میں بھی اس سے انتشار پسند طاقتوں کی ہمت افزائی ہوگی۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کسی تجویز کو بھی آپ خارج از بحث قرار نہ دیں بلکہ کان فرنس کی میز کے گرد بیٹھ کر دوستانہ ماحول میں ہر تجویز کے حسن و قبح پر بات چیت کر کے یہ ثابت کریں کہ فلاں تجویز سے وہ امن و آشتی نہ حاصل ہو سکے گی جو جانبین کا مشترکہ مطمحِ نظر ہے۔ میرا اصرار زور اس پہلو پر تھا کہ طرفین اپنی بے لوچ روش کو ترک کر کے دوسروں کا نقطۂ نظر، بلاظن و گمان، سننے پر آمادہ ہوں۔

اس [کشمیر کے] قضیئے میں بدقسمتی سے ہندستان و پاکستان دونوں بے طرح الجھ گئے ہیں۔ اس لئے صرف کان فرنس ہی میں اس کا کوئی ایسا حل ڈھونڈھا جاسکتا ہے، جسے طرفین اپنے اپنے عوام کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ موجودہ حالات میں یہی ایک عملی، باعزت اور منصفانہ حل ہے، اور کان فرنس سے اٹھنے کے بعد کسی فریق کو بھی شکست خوردگی کا احساس نہ ہو۔

دہلی تشریف لانے اور پنڈت نہرو سے ملنے کے لئے آپ، از راہِ عنایت آمادہ بھی ہو گئے تھے، لیکن ہماری بدنصیبی سے ان کی [پنڈت نہرو کی] ناوقت اور اندوہناک موت نے یہ موقع ہم سے چھین لیا۔

آپ کا مخلص   شیخ محمد عبداللہ

کتابیات

Campbell-Jhonson : *Mission With Mountbatten*

Keesing's Contemporary Archives : 1953

Margret Brouke-white : *Halfway to Freedom*

Mahajan : *Accession of Kashmir to India*

The Last Phase— پیارے لال

Delhi Diary—

India Wins Freedom— مولانا ابوالکلام آزاد

Sadiq-Abdullah Correspondence

Report on Kashmir—

Sisir Gupta : *Kashmir — A Study of Indo-Pakistan Relations*

اخبارات

آئینہ (ہفتہ وار) سری نگر

سچ 〃 جموں

محاذ 〃 سری نگر

اسٹیٹسمین (روزنامہ) دہلی

مُصنّف کی دوسری کتابیں

ہندُستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں	۱۲/-
گل کرسٹ اور اُس کا عہد	۴/-
صُوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبُوعات	۹/-
Origins of Modern Hindustani Literature	15/-
اٹھارہ سو ستاون ــــ اخبارات و دستاویزیں	۲۰/-
خان بابا (خان عبدُالغفار خاں)	۱/-

زیرِ طبع

یادوں کے سائے

گلشنِ نوبہار (مہاراجا سندھیا کا سفرنامہ)

زیرِ تالیف

نیا کشمیر ــــ تین رُخ

DR. SPRENGER—THE ORIENTALIST

مکتبۂ شاہراہ۔ اردو بازار۔ دہلی

کتابیات

Camphell-Jhonson : *Mission With Mountbatten*

Keesing's Contemporary Archives : 1953

Margret Brouke-white : *Halfway to Freedom*

Mahajan : *Accession of Kashmir to India*

The Last Phase— پیارے لال

Delhi Diary—

India Wins Freedom— مولانا ابوالکلام آزاد

Sadiq-Abdullah Correspondence

Report on Kashmir—

Sisir Gupta : *Kashmir—A Study of Indo-Pakistan Relations*

اخبارات

آئینہ (ہفتہ وار) سری نگر

سچ 〃 جموں

محاذ 〃 سری نگر

اسٹیٹسمین (روزنامہ) دہلی